ایف اے
داخلہ جاری

اقتدار احمد ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام
ایف اے اور بی اے کی معیاری تعلیم کا جدید ادارہ

طوبیٰ گرلز کالج لاہور

- اسلامی تعلیمات اور نظریہ پاکستان کے فروغ پر خصوصی توجہ
- باپردہ اور پاکیزہ ماحول
- خوبصورت اور کشادہ عمارت
- ماڈرن کمپیوٹر لیب اور کمپیوٹر کی لازمی تعلیم بلا اضافی فیس
- طالبات کے لئے ٹرانسپوٹ (Pick & Drop) کی سہولت
- بیرون لاہور کی طالبات کے لیے ہوسٹل کی محدود سہولت

مزید معلومات کے لئے پراسپیکٹس حاصل کریں

طوبیٰ گرلز کالج 78 سیکٹر اے ون ٹاؤن شپ لاہور
فون 5114581 E-mail: toobacollege@ hotmail.com

DESIGN UNIT

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ
میثاق
لاہور

جلد: ۵۱
شمارہ: ۸
جمادی الاخریٰ ۱۴۲۳ھ
اگست ۲۰۰۲ء
فی شمارہ ۱۲/-

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

☆ اندرون ملک 125 روپے
☆ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 800 روپے
☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1000 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36-کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 03-02-5869501
فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67-گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور
فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110
ای میل: markaz@tanzeem.org

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ **عرض احوال** ———— ۳

حافظ عاکف سعید

☆ **تذکرہ و تبصرہ** ———— ۴

اسی کے پردے میں زندگی کی نئی سحر جگمگا رہی ہے!

☆ **حقیقت دین** ———— ۷

ایمان بالآخرۃ کی اہمیت اور انکارِ آخرت کی مختلف صورتیں

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ **ذکر کثیر سے کیا مراد ہے؟** ———— ۳۵

مختار حسین فاروقی

☆ **منہاج المسلم** (۲۳) ———— ۳۸

مخلوق سے تعلق کے آداب

علامہ ابو بکر الجزائری

☆ **فکر و نظر** ———— ۵۰

ولیمے کا وجوب اور جامع ترمذی کی ایک روایت

حافظ نذیر احمد ہاشمی

☆ **توضیح و تنقیح** ———— ۵۲

فکر اسلامی کو مسخ کرنے کی سازش

خالد محمود عباسی

☆ **تازیانہ تاریخ** ———— ۷۵

''کاش میں اُسؐ کے پاس جا سکتا اور اُسؐ کے پاؤں دھوتا''

صلاح الدین ناسک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض احوال

گزشتہ ہفتہ کے دوران کراچی سے شائع ہونے والے بعض اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ کوئٹہ کی عدالت برائے انسداد دہشت گردی کی جانب سے امیر تنظیم اسلامی کو اشتہاری ملزم قرار دیا گیا ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے اس خبر کی صدائے بازگشت امریکہ تک جا پہنچی تو ہمارے متعدد دوستوں نے نیویارک اور شکاگو سے احوال واقعی کی وضاحت کے لئے ہم سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور اپنی تشویش کا اظہار کیا ـــ سطور ذیل میں ہم اپنے قارئین کے اطمینان کے لئے وضاحت کئے دیتے ہیں۔

صورت واقعہ یہ ہے کہ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد جب امریکہ کے غیظ وغضب کا رخ افغانستان کی طالبان حکومت اور وہاں پناہ گزین اسامہ بن لادن کی جانب مڑ گیا اور امریکہ نے افغانستان کے خلاف جنگی کارروائی کا اعلان کیا تو پاکستان میں ''دفاع افغانستان و پاکستان کونسل'' کے تحت اس ننگی جارحیت کے خلاف اور طالبان کی حمایت میں ملک گیر سطح پر جلسوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہو۔

اس سلسلے میں کوئٹہ شہر میں ۲ نومبر ۲۰۰۱ء کو دفاع افغانستان و پاکستان کونسل کے زیر اہتمام جو جلسہ عام منعقد ہوا' اس میں شرکت کے لئے امیر تنظیم اسلامی کو خاص طور پر دعوت دی گئی تھی۔ یہ جلسہ معمول کے مطابق پر امن طور پر منعقد ہوا اور امیر تنظیم کے علاوہ دیگر دینی جماعتوں کے مقامی قائدین نے بھی خطاب کیا ـــ قریباً دو ماہ بعد کوئٹہ کے بعض ساتھیوں کے ذریعے یہ بات ہمارے علم میں آئی کہ ۲ نومبر کے جلسہ میں خطاب کرنے والے تمام مقررین کے خلاف ایف آئی آر کاٹی گئی تھی جس میں ''عوام کو حکومت کے خلاف اشتعال دلانا'' قسم کے الزامات درج تھے' لیکن اس ایف آئی آر کو سیل کر دیا گیا تھا۔

اب قریباً آٹھ ماہ گزرنے کے بعد اس ایف آئی آر کو سرد خانے سے نکال کر انسدادِ دہشت گردی عدالت کے سپرد کیا گیا ہے جس کی طرف سے کوئی باقاعدہ عدالتی نوٹس تو تاحال امیر تنظیم کو موصول نہیں ہوا' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اپنی جانب سے کوئی سطحی سی کارروائی کرنے کے بعد امیر تنظیم سے رابطہ نہ ہونے پر مذکورہ عدالت نے کوئٹہ کے ایک اخبار کے ذریعے انہیں اشتہاری قرار دے دیا اور ۲ر اگست کو امیر تنظیم کو طلب کیا ہے کہ اگر عدالت میں مقررہ تاریخ کو پیش نہ ہوئے تو یکطرفہ طور پر مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا جائے گا ـــ

(باقی صفحہ ۸۰ پر)

تذکرہ و تبصرہ

حافظ عاکف سعید

اسی کے پردے میں زندگی کی نئی سحر جگمگا رہی ہے!

۱۱/ستمبر۲۰۰۱ء اب ماہ و سال کے حوالے سے کسی تاریخ کا نام نہیں' ایک تاریخی کروٹ کا نام ہے جس نے ازل سے جاری حق و باطل کی کشمکش کو ایک نئی جہت اور سرعتِ رفتار سے آشنا کیا ہے ـــــ دنیا کی اسلام دشمن طاقتوں کے سب سے بڑے محافظ اور سرپرست امریکہ کے غرور کی دھجیاں بکھیرنے والا یہ ناگہانی حملہ اپنے ردِعمل کے اعتبار سے اوّلاً اہلِ حق کے لئے ایک کڑی آزمائش اور ظاہری ناکامیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوا لیکن اسی کی کوکھ سے احیاءِ اسلام کی کرنیں بھی پھوٹنا شروع ہوئیں جس نے باطل قوتوں کی صفوں میں ایک اضطراب پیدا کر دیا ہے۔

۱۱/ستمبر سے قبل عالم اسلام پر اگر نگاہ ڈالیں تو قریباً پورا عالم اسلام باطل قوتوں سے مفاہمت کی پالیسی پر عمل پیرا اور ان کے آگے عملاً سربسجود نظر آتا ہے ـــــ تمام نام نہاد اسلامی حکومتیں تو آج بھی پہلے کی طرح ''شیطانِ بزرگ'' یعنی امریکہ کے گھڑے کی مچھلیاں بن کر اسلام کے خلاف امریکی مفادات کے کھیل میں ''کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری'' کے انداز میں آلۂ کار بنی ہوئی ہیں لیکن ۱۱/ستمبر سے قبل مسلمان عوام بھی ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز'' کا نقشہ بنے ہوئے تھے اور زندگی کی کوئی رمق ان میں کہیں دور دور نظر نہ آتی تھی۔ سوائے اس کے کہ ''الجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے'' کے مصداق' عالم اسلام میں کہیں کہیں حقیقی روحِ اسلام سے آشنا مٹھی بھر لوگ ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز'' کا علم ہاتھ میں اٹھائے انقلابی انداز میں غلبۂ و اقامت دین کو اپنی زندگیوں کا مشن بنائے اپنے محدود وسائل کے ساتھ سرگرمِ عمل تھے اور مسلمانوں کو حاضر و موجود سے بیزاری کا سبق پڑھا رہے تھے ـــــ ان میں نمایاں ترین گروہ افغانستان کے ان طالبان کا تھا جو اقتدار ملنے کے

بعد وسائل کی شدید کمی کے باوجود نفاذِ شریعت کو ہر دنیاوی مفاد پر ترجیح دینے کا تہیہ کئے ہوئے تھے اور حق کی خاطر دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر مول لینے کے لئے تیار تھے ـــــ بقیہ پورا عالم اسلام نہ صرف یہ کہ خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا بلکہ عام مسلمانوں کی تمام تر ہمدردیاں اور ذہنی ہم آہنگی دین اسلام کے وفاداروں کی بجائے ان اسلام دشمن طاقتوں اور تہذیبوں کے ساتھ تھیں جو حقیقی اسلامی روح کو کچلنے کے لئے طویل منصوبہ بندی میں مصروف تھیں۔ رہیں غیر مسلم اقوام تو وہ سرے سے اسلام کو قابل التفات اور اسلامی تعلیمات کو قابل مطالعہ سمجھتی ہی نہ تھیں۔

11 ستمبر کے بعد اگرچہ دینِ حق کے وفاداروں پر کڑا وقت آیا جب وقت کا فرعون' امریکہ اپنی پوری جنگی قوت کے ساتھ افغانستان پر حملہ آور ہوا۔ طالبان سے اگرچہ اقتدار چھن گیا' ان کی ایک بڑی تعداد بشمول چوٹی کی قیادت کے' آج بھی بحمد اللہ محفوظ ہے اور دوبارہ صف بندی کی تیاری کر رہی ہے تاہم ایک قابل ذکر تعداد مرتبۂ شہادت سے بھی سرفراز ہوئی' اسامہ بن لادن اور ان کے وہ ساتھی جو روس کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کے لئے دنیا کی تمام آسائشوں کو تج کر افغانستان کے بیابانوں میں جا آباد ہوئے تھے' اگرچہ نہایت سخت امتحانات سے دوچار ہوئے' ان پر قافیہ حیات اس قدر تنگ کر دیا گیا کہ پاکستان جیسے ''اسلامی'' ملک نے بھی انہیں پناہ دینے سے انکار کر دیا اور یوں بظاہر اہل حق کو پے بہ پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا ـــــ لیکن ان کی یہ قربانیاں رائیگاں نہیں گئیں ـــــ ان میں سے جو شہادت سے ہمکنار ہوئے وہ امر ہو گئے' جنھوں نے ہر طرح کی سختیاں گوارا کیں لیکن راہِ حق سے منحرف نہ ہوئے وہ اپنی مراد یعنی رضائے ربّ سے شادکام ہوئے' ان کے مقام و مرتبہ کا کیا ٹھکانا ـــــ لیکن ان کی قربانیوں اور استقامت کے نتیجے میں پوری دنیا میں احیاءِ اسلام کا غلغلہ بلند ہو چکا ہے۔ بی بی سی کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق مغربی دنیا میں آج جو مذہب نہایت تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے وہ اسلام کے سوا اور کوئی نہیں۔ رپورٹ کے مطابق ۱۱ر ستمبر

کے بعد سے آج تک ۲۴ ہزار امریکی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ امریکہ میں اسلام اور قرآن کے مطالعے کے شوق کی آگ یکدم تیز ہوگئی ہے—— قرآن کو سمجھنے کی جستجو اور اسلامی تعلیمات سے آگاہ ہونے کا اشتیاق غیر معمولی طور پر بڑھا ہے—— دین اسلام جسے مسلمانوں نے ایک مُردہ مذہب بنا رکھا تھا' ایک زندہ قوت کے طور پر پوری دنیا میں متعارف ہو رہا ہے۔ اس کا تمامتر سہرا اُن مخلص طالبان کو جاتا ہے جو ''لڑا دے ممولے کو شہباز سے'' کا مصداق ثابت ہوئے اور انہوں نے امریکہ جیسی بڑی طاقت کے مقابلے میں عزیمت اور استقامت کا وہ غیر معمولی مظاہرہ کیا جس نے پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا۔

اسی طرح عالم اسلام میں بھی ایک عمومی بیداری کی لہر پیدا ہوئی ہے—— امریکہ اگر ایک طرف مجاہدین اسلام کے سرخیل ملا محمد عمر اور اسامہ بن لادن کو ختم کرنے اور مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو کچلنے کے درپے ہے تو دوسری طرف پورے عالم اسلام میں ان دونوں محترم شخصیات کو محبوب ترین رہنماؤں کا درجہ حاصل ہو چکا ہے اور یہ دونوں رہنما عالم اسلام میں جذبۂ جہاد کی بیداری کی علامت بن گئے ہیں—— گویا ؎

گر اک چراغ حقیقت کو گُل کیا تم نے   تو موجِ دود سے صد آفتاب ابھریں گے

کی عملی صورت پیدا ہو چکی ہے—— اسی طرح **11** ستمبر کے بعد تصویر کا ایک روشن رخ یہ بھی ہے کہ امریکہ اور اس کی حلیف مغربی طاقتوں کے اسلام دشمن عزائم پوری طرح کھل کر مسلمانانِ عالم کے سامنے آ چکے ہیں اور وہ اس غلط فہمی کی دھند سے باہر نکل آئے ہیں کہ یہ عالمی طاقتیں عدل و انصاف اور اصول و اخلاق کی علمبردار ہیں' بلکہ ان طاقتوں کا مکروہ چہرہ اب پوری طرح بے نقاب ہو چکا ہے۔ عالم اسلام میں بیداری کی لہر پیدا ہو چکی ہے لیکن مغربی طاقتوں کی گرفت ابھی اتنی مضبوط ہے کہ احیاء اسلام کے حوالے سے نمودار ہونے والے سپیدۂ سحر کو پوری طرح پھیلنے میں ابھی خاصا وقت بھی لگے گا اور عشق کے بہت سے امتحانات سے اسلام کے وفاداروں کو ابھی گزرنا ہوگا ○○

ایمان بالآخرۃ کی اہمیت اور انکارِ آخرت کی مختلف صورتیں

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد
مرتب: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسلام دین توحید ہے۔ یعنی دین میں مرکزی حیثیت ایمان باللہ کو حاصل ہے۔ ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ میں بھی بنیادی ایمان ایمان باللہ ہی ہے' باقی دونوں اس کی فروع ہیں۔ رسالت اللہ تعالیٰ کی صفت ہدایت کا ظہور ہے' چنانچہ ایمان بالرسالت ایمان باللہ کی ایک شاخ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ گویا ایمان بالآخرۃ بھی ایمان باللہ کی ایک شاخ ہے۔ دیکھئے ایمان مجمل میں صرف ایمان باللہ کا ذکر ہے: آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ۔ جبکہ اس اجمال کی تفصیل ایمان مفصل میں ہے۔ یعنی: آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عملی اعتبار سے انسان کی سیرت و کردار پر سب سے زیادہ ایمان بالآخرۃ اثر انداز ہوتا ہے۔ آخرت کی جواب دہی کا احساس ہوگا تو انسان کا رویہ درست ہوگا۔ کسی وجہ سے آخرت کی مسئولیت کا احساس کمزور اور مضمحل

ہو جائے گا تو ایمان باللہ صرف ایک ذہنی بحث بن کر رہ جائے گا‘ وہ ذات وصفات کا ایک گورکھ دھندہ بن کر رہ جائے گا‘ انسان کے کردار پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ البتہ اگر یہ یقین پختہ ہو جائے کہ اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے‘ جہاں جواب دہی ہوگی‘ حساب کتاب ہوگا اور اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملے گی تو زندگی لازماً نیکیوں کی طرف رغبت اور برائیوں سے نفرت کے ساتھ گزرے گی۔ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات تو پہلی وحی کی ہیں‘ اس کے بعد کی تین آیات میں ایمان بالآخرۃ ہی کا ذکر ہے۔ میرے نزدیک حکمت قرآنی کا یہ ایک بہت بڑا خزانہ ہے۔ فرمایا:

﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ ۞ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۞ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۞﴾

''انسان ظلم وتعدی اور دست درازی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو آزاد دیکھتا ہے۔ (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے ربّ ہی کی طرف ہے''۔

انسان دیکھتا ہے کہ دُنیا میں پکڑ نہیں ہوتی۔ جھوٹ بولا کچھ نہیں ہوا‘ کسی پر تہمت لگائی کوئی سزا نہیں ملی‘ کسی کا مال حرام طریقے سے ہڑپ کر لیا مگر پیٹ میں درد تک نہیں ہوا‘ کسی کو گالی دی مگر زبان پر چھالا تک نہیں نکلا‘ کیونکہ اخلاقی اعمال کے نتائج بالعموم اس دُنیا میں نہیں نکلتے۔ لہٰذا انسان سرکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اب اس کا حل کیا ہے؟ یہی کہ ﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۞﴾ ''یقیناً تیرے ربّ کی طرف ہی لوٹنا ہے''۔ پس جب ربّ کے حضور میں مسئولیت کا یقین ہو تو قدم برائی سے رکتے ہیں۔ چنانچہ اصولی طور پر اصل ایمان ایمان باللہ ہے‘ البتہ انسان کے کردار اور رویہ پر اثرات مترتب ہونے کے اعتبار سے اہم ترین ایمان ایمان بالآخرۃ ہے۔

یوں سمجھئے کہ جب اللہ کی رضا انسان کا نصب العین بن جائے اور آخرت کی کامیابی منزل مقصود قرار پائے تو اب ضرورت ہوگی صراطِ مستقیم کی جو انسان کو وہاں تک پہنچا دے اور یہ صراطِ مستقیم ہمیں رسول ﷺ کے ذریعے ملتا ہے۔ پس یہیں سے ایمان بالرسالت کی اہمیت متعین ہوتی ہے کہ ہمیں یہ ہدایت کس سے ملتی ہے کہ کیا کریں کیا نہ کریں‘ کدھر جائیں کدھر نہ جائیں۔ انسانی زندگی میں بے شمار چوراہے آتے ہیں‘ اگر

کسی جگہ غلط موڑ مڑ گئے تو ہلاکت اور ضلالت کا اندیشہ ہے ؏ یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دُور شد۔ انسان نیک نیتی کے ساتھ بھی غلط راستے پر پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اسے ایک مستقل ہدایت چاہئے اور وہ ہدایت انسان کو انبیاء و رُسل سے ملتی ہے۔ اس اعتبار سے اہم ترین ایمان ایمان بالرسالت ہے۔ یہاں ایک بحث ختم ہوئی' اب آیئے دوسری طرف۔

دُنیا و آخرت کا قرآنی تقابل

قرآن مجید میں دُنیا و آخرت کا باہمی تقابل بہت سے مقامات پر آیا ہے۔ چونکہ انسان کے عملی رویئے کے اعتبار سے اہم ترین چیز آخرت کا یقین ہی ہے لہٰذا اس کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آتا ہے۔ مثال کے طور پر چند مقامات کا تذکرہ کافی ہوگا۔ سورۃ الاعلیٰ کی آیت ۱۶' ۱۷ میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی ساری گمراہی کی اصل جڑ یہی ہے کہ وہ آخرت کی بجائے دُنیا کو اپنا مطلوب بنالیتا ہے ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۞ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۞﴾ ''اصل گمراہی یہ ہے کہ تم ترجیح دیتے ہو دُنیا کی زندگی کو' دراں حالیکہ آخرت بہت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی ہے''۔ یہ دُنیا اس قدر حقیر شے ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی نگاہ میں دُنیا و مافیہا کی وقعت اگر مچھر کے ایک پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا''۔ اس لئے کہ یہ تو بالکل حقیر شے ہے' اس کی تو کوئی حقیقت ہی نہیں۔ سورۃ الزخرف کی آیات ۳۳ تا ۳۵ میں ہے کہ:

> ''اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کو ایسے محل دے دیتے جن کی چھتیں' اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالا خانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیئے لگا کر بیٹھتے ہیں سب چاندی اور سونے کے بنا دیتے۔ یہ تو محض حیاتِ دُنیا کی متاع ہے' اور آخرت تیرے ربّ کے نزدیک صرف متقین کے لئے ہے۔''

اسی طرح سورۃ القیامہ میں فرمایا:

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝﴾

''تمہاری اصل گمراہی یہ ہے کہ تم عاجلہ سے محبت کرتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو''۔

یہ عاجلہ' جلدی کی شے' دُنیا ہے۔ یہاں کی خوشی بھی نقد ہے اور یہاں کا غم بھی فوری ہے۔ انسان بس اس نقد کو ہی نظر میں رکھتا ہے اور آخرت کو چھوڑ دیتا ہے۔ تو گویا گمراہی کا اصل سبب آخرت کی اہمیت کو نظر انداز کرنا ہے اور اس کے اثرات پھر عمل پر مترتب ہوتے ہیں۔ اب دیکھئے سورۃ النساء کی آیت ۱۳۴:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝﴾

''جو شخص صرف دُنیا کا بدلہ چاہتا ہے اسے جان لینا چاہئے کہ اللہ کے پاس دُنیا اور آخرت دونوں کا بدلہ موجود ہے' اور اللہ سننے والا' دیکھنے والا ہے''۔

یہ تمہاری طلب کی تنگی اور نگاہ کی کوتاہی (short sightedness) ہے' ورنہ اللہ کے پاس تو کوئی کمی ہے ہی نہیں' جیسا کہ اقبال نے کہا۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے!

یہ تمہاری طلب کا قصور ہے کہ تم اسے دُنیا تک محدود کر کے بیٹھ گئے' ورنہ اللہ کے پاس تو دُنیا بھی ہے اور آخرت بھی ہے' اور وہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۴۵ دیکھئے:

﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾

''جو کوئی دُنیا کا ثواب چاہتا ہے اسے ہم اس میں سے دیتے ہیں' اور جو آخرت کا ثواب چاہتا ہے اسے ہم اس میں سے دیتے ہیں' اور عنقریب ہم شکر گزار لوگوں کو جزا دیں گے''۔

یہاں ثواب کے معانی سمجھئے۔ ہر انسان کے پاس قوّت ہے‘ صلاحیت ہے‘ وقت ہے۔ یہ ہمارا اصل سرمایہ ہے۔ اسی کو ہم invest کرتے ہیں۔ جیسے ایک حدیث میں ہے:

((کُلُّ النَّاسِ یَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ)) (صحیح مسلم)

’’ہر انسان صبح کرتا ہے تو (شام تک) اپنے آپ کو بیچتا ہے‘‘۔

وہ اپنی قوت بیچ رہا ہے‘ توانائی بیچ رہا ہے‘ ذہانت اور صلاحیت بیچ رہا ہے‘ اپنا وقت بیچ رہا ہے۔ کہیں دفتر میں بیٹھا اس کی تنخواہ لے رہا ہے‘ کہیں مزدور مزدوری کر رہا ہے تو جسمانی مشقت بیچ رہا ہے۔ اسے شام کو مزدوری مل جائے گی۔ گویا ہر شخص اپنے آپ کو بیچ رہا ہے۔ اس بیچنے کا ایک نتیجہ دُنیا میں نکلتا ہے اور ایک نتیجہ وہ ہے جو آخرت میں نکلتا ہے۔ پس یہ فیصلہ انسان کو کرنا ہے کہ وہ جو بھی توانائیاں‘ قوتیں اور صلاحیتیں یہاں صرف کر رہا ہے یا invest کر رہا ہے ان کا بدلہ وہ یہاں چاہ رہا ہے یا وہاں چاہ رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ دُنیا کے طالب کو ہم اس میں سے دے دیتے ہیں۔ اچھا مکان لے لو‘ ساز و سامان لے لو‘ گاڑی لے لو‘ یہی کچھ تمہیں چاہئے‘ یہ تمہیں یہیں مل جائے گا! اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا اسے ہم اس میں سے دیں گے۔

﴿وَسَنَجْزِی الشّٰکِرِیْنَ﴾

’’اور جو شکر کرنے والے ہیں انہیں ہم بدلہ دیں گے۔‘‘

اس میں ایک عجیب انداز ہے۔ ان الفاظ کے اندر جو کیفیت ہے اس کو اگر انسان پالے تو اسے سرور حاصل ہوگا۔ شکر گزار بندوں کو کیا بدلہ دیں گے؟ یہ ظاہر نہیں کیا۔ بسا اوقات ابہام میں بہت زیادہ فصاحت اور بلاغت ہوتی ہے۔ کسی چیز کو واضح اور معین کر دیا جائے تو اس کی وہ کیفیت نہیں رہتی جو اس کے ابہام میں ہے۔

سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۲ میں مخاطب صحابہ کرامؓ تھے اور تبصرہ جنگ اُحد پر ہو رہا تھا‘ جہاں عبداللہ بن اُبی ایک تہائی تعداد کو پہلے ہی لے کر جا چکا تھا۔ یعنی اب ان بقیہ سات سو میں کوئی منافق نہ تھا۔ چنانچہ ان مؤمنین صادقین سے فرمایا جا رہا ہے:

﴿حَتّٰۤی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا

تُحِبُّوْنَ ط مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ج﴾

''مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا' اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جو تمہیں محبوب تھی (یعنی فتح) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ تم میں سے کچھ لوگ دُنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے''۔

تمہارے اندر وہ بھی ہیں جو کسی درجے میں ابھی دُنیا کے طالب ہیں اور تم میں سے ایسے بھی ہیں جو صرف آخرت کے طلب گار ہیں۔ اگرچہ میرے نزدیک یہاں دُنیا سے مراد مال ومتاعِ دُنیوی نہیں۔ جن لوگوں نے مالِ غنیمت سمجھا ہے غلطی کی ہے۔ یہاں دُنیا سے مراد ہے دُنیا میں فتح وکامرانی۔ درحقیقت بندۂ مؤمن اپنی اقامت دین کی جدوجہد میں بھی دُنیا میں کامیابی کو اگر اپنا مقصود بنا لے گا تو راستے سے ہٹ جائے گا اور غلط راستے پر پڑ جائے گا۔ اس کا اصل مقصود تو فقط ادائیگی فرض ہے اور اللہ کے ہاں اجر و ثواب۔ اگر دُنیا کی کامیابی کو ہدف بنالیا جائے گا تو یہ بھی درحقیقت انسان کو سیدھی راہ سے ہٹانے والی سب سے بڑی شے ہے۔ اسی کا نام جلد بازی ہے۔ اس مرحلے پر انسان ''by hook or by crook'' بہر حال دُنیا کی کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکل رہا تو ٹیڑھی انگلی سے نکالے گا' اس لئے کہ اس نے دُنیا میں کامیابی کو مطلوب بنا لیا ہے' جبکہ ہمارا مطلوب یہ نہیں ہے کہ دُنیا میں انقلاب ضرور لائیں' بلکہ ہمارا فرض تو صرف یہ ہے کہ اپنی بساط کے مطابق اپنی ذمہ داری پوری کریں' اس میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ تو میرے نزدیک یہاں دُنیا سے مراد دُنیوی کامیابی ہے۔

یاد رکھئے جن لوگوں کا اصل مقصود دُنیا ہے وہ اگر نماز روزہ بھی کر رہے ہیں تو ان کی حیثیت ایک رسم کے سوا کچھ نہیں ؎

رہ گئی رسم اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی!

دراصل یہی فیصلہ کن بات ہے کہ مقصود دُنیا ہے یا آخرت! دیکھئے عبادات میں چوٹی کی عبادت ہے حج۔ یہ جامع العبادات ہے' جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ حج مبرور گزشتہ تمام زندگی کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے' صرف دو اعمال اور ہیں جو گزشتہ زندگی کے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں' ایک کفر سے اسلام میں داخل ہو جانا' دوسرے ہجرت فی سبیل اللہ۔ تو حج اتنی اونچی عبادت ہے۔ سورۃ البقرۃ میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں کہ وہاں پہنچ کر بھی صرف دُنیا مانگتے ہیں' اس لئے کہ ان کا اصل مقصود ہے ہی دُنیا۔ وہ ملتزم سے چمٹتے ہیں تب بھی دُنیا ہی طلب کر رہے ہیں۔ وہ عرفات میں ہاتھ پھیلائے ہوئے بھی دُنیا ہی مانگ رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر بھی اصل شے جو دل میں ہے وہی باہر نکلے گی۔ عربی کا ایک مقولہ ہے کہ ظرف میں جو کچھ ہوتا ہے وہی ٹپکتا ہے' یعنی جو اندر ہے وہی باہر نکلے گا۔ جب دل میں دُنیا رچی بسی ہے تو وہاں جا کر اس کی ذہنیت کیسے بدل جائے گی؟ سرشت ایک دم کیسے تبدیل ہو جائے گی؟ وہاں جا کر بھی وہ اللہ سے صرف دُنیا مانگے گا۔ ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں پھر کوئی حصہ نہیں۔ فرمایا:

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ (البقرۃ:۲۰۰)

''لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں دُنیا ہی میں سب کچھ دے دے۔ ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں''۔

حرم شریف سے بڑھ کر اور کوئی مقام دعاؤں کی قبولیت کا نہیں۔ مگر یہ کتنی محرومی ہے کہ وہاں بھی دُنیا ہی طلب کی جائے۔ پھر فرمایا:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (البقرۃ:۲۰۱)

''اور ان میں وہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما' اور ہمیں جہنم کی آگ سے بچا!''

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں

جنہیں حصّہ ملے گا اپنے کسب میں سے''۔ قابل غور ہے یہ مقام! یعنی یہ نہیں کہ دعا مانگ کر ہی بس وہ فارغ ہو جائیں گے' بلکہ جن لوگوں کو آخرت کی حقیقی طلب ہے ان کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس کے لئے بھرپور کوشش' جدوجہد اور محنت کرنا ہو گی اور ﴿لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۞﴾ کا قاعدہ کلیہ ختم نہیں ہو جائے گا۔ اس طرح اس آیت میں ہمارے لئے انذار کا پہلو بہت نمایاں ہے اور یہ قابل غور بھی ہے۔ یعنی انسان طالب آخرت بن کر جو محنت اور سعی و جہد کرتا ہے وہ یہ نہ سمجھے کہ اسے اس کا پورا پورا اجر و ثواب مل جائے گا۔ کوئی پتہ نہیں شیطان نے کہیں ریاکاری کی آمیزش کرا دی ہو' کہیں کسی وقت دل میں عُجب پیدا ہو گیا ہو۔ لہٰذا یہ سارے خطرات موجود رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ تو اس کی ایک ایک حقیقت کو جانتا ہے کہ اس میں خلوص کتنا تھا' ریاکاری کتنی تھی' محض رسماً کتنے کام ہو رہے تھے اور حقیقتاً کتنے کام ہو رہے تھے' کن چیزوں کے لئے واقعتاً اس نے محنت کی تھی اور کون سی چیزیں ایسی تھیں جو محض عادت بن گئی تھیں۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کہتے ہیں کہ جو عبادت عادت بن جائے اس کا ثواب کم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ آخرت کے لئے جو بھی محنت کی ہو گی اس میں سے حصّہ ملے گا۔ اور تمہیں تو مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہر عمل کی باریک بینی کیسے ہو گی! آخر اتنے سارے اعمال ہوں گے تو ہر عمل کا تجزیہ کیسے ہو گا کہ اس میں خلوص کتنا تھا اور کھوٹ کتنا تھا! واقعتاً اس میں اللہ کے لئے کتنا اخلاص تھا اور ریاکاری کتنی تھی! تو فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۞﴾ ''اللہ کو حساب چکانے میں دیر نہیں لگتی''۔ اس کی فکر تم مت کرو۔ اس کے ہاں جو کمپیوٹر لگے ہوئے ہیں وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں گے اور آنِ واحد میں اندر کی چیزیں ظاہر ہو جائیں گی۔ اس کے لئے یہ بات بہت آسان ہے۔

بات ایمان بالآخرۃ پر ہو رہی تھی۔ قرآن حکیم کے بارے میں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ قرآن مجید کا اسلوب انسانی تصنیفات کی طرح نہیں ہے۔ دُنیا کی کتابوں میں ابواب ہوتے ہیں۔ ہر باب میں ایک عنوان پر بحث ہوتی ہے' پھر اگلے ابواب میں

اس کا اعادہ نہیں ہوتا' بلکہ تکرار تصنیف کا عیب شمار ہوتی ہے' مگر قرآن مجید اپنے اسلوب میں منفرد ہے۔ اس میں بہت سے مضامین ایسے ہیں جو بار بار آئے ہیں۔ اپنے اسی انداز کو قرآن خود اپنی خاص اصطلاح ''تصریف آیات'' سے تعبیر کرتا ہے۔ یوں ایک ہی بات کو مختلف انداز میں بیان کیا جاتا ہے' کہیں مجمل کہیں مفصل' تاکہ صحیح طور پر ذہن نشین ہو جائے۔ بمصداق ؎ اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں! مشکل اور اہم مضامین کو تدریجی ارتقاء کے ساتھ مختلف انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے اس اسلوبِ بیان سے واقف ہو۔ تو ایمان بالآخرۃ کا ذکر مختلف انداز سے قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے۔ دُنیا اور آخرت کا تقابلی تذکرہ بھی ہے کہ انسان یہ فیصلہ شعوری طور پر کر لے کہ اس کا مطلوب و مقصود دُنیا ہے یا آخرت۔ وہ اپنی ترجیحات طے کر لے۔ اگر ترجیحات طے نہ کرے گا تو کبھی دائیں کبھی بائیں بھٹکتا پھرے گا۔ کبھی کوئی چیز اسے کھینچ لے گی کبھی کوئی اور چیز کھینچ لے گی۔ جب priorty طے ہو جائے تو پھر انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ دوسری چیزیں حاصل ہو جائیں تو فبھا' نہ ہوں تو کوئی ملال نہیں' ہاں اصل گوہر مقصود ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہئے۔ پس مؤمن صادق کے لئے مقصود کا تعین نہایت ضروری ہے کہ وہ طالب آخرت ہے' طالب دُنیا نہیں۔

اب سورۃ الشوریٰ کی آیت ۲۰ ذہن میں تازہ کر لیجئے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ۝﴾

''جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طالب بن جائے ہم اس کی کھیتی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اور جو کوئی دُنیا کی کھیتی کا طالب بن جائے ہم اسے اس میں سے دے دیتے ہیں' لیکن پھر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں''۔

اسی مضمون کو سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۵' سورۃ الاعلیٰ کی آیت ۱۶'۱۷ اور سورۃ النساء کی آیت ۱۳۱ میں مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا ہے۔

اب طلب دُنیا اور طلب آخرت کے تقابلی مطالعے کے لئے سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۱۸ تا ۲۱ ملاحظہ کیجئے۔ میرے نزدیک اس موضوع پر یہ قرآن مجید کا ذروۂ سنام ہے۔ پہلے بیان شدہ تمام مباحث یہاں کمالِ جامعیت کے ساتھ سامنے رکھ دیئے گئے ہیں۔اور بات اپنی آخری منطقی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۞ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۞ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۞ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۞﴾

''جو کوئی (اس دُنیا میں) جلدی حاصل ہونے والے فائدوں کا خواہش مند ہو اسے ہم یہیں دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں' پھر اس کے لئے جہنم کا فیصلہ کر دیتے ہیں' وہ اس میں جلے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر۔اور جو آخرت کا طالب ہو اور اس کے لئے سعی کرے جیسی کہ اس کے لئے سعی کرنی چاہئے' اور ہو وہ مؤمن' تو ایسے ہر شخص کی سعی کی قدر کی جائے گی (اور اسے اس کا پھل مل کر رہے گا۔) اِن کو بھی اور اُن کو بھی' دونوں فریقوں کو ہم (دُنیا میں) سامانِ زیست دیئے جا رہے ہیں' یہ تیرے ربّ کا عطیہ ہے' اور تیرے ربّ کی عطا کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ دیکھ لو! (دُنیا میں) ہم نے ایک گروہ کو دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے۔ رہی آخرت تو وہاں اور بھی بڑے درجے ہوں گے اور فضیلت اور بھی بڑھ چڑھ کر ہو گی''۔

یہاں پر لفظ دُنیا کی بجائے ''عاجلہ'' آیا ہے۔ آخرت کی زندگی کے لئے قرآن مجید میں کم و بیش ''آخرت'' ہی کا لفظ آیا ہے' مگر دُنیا کی زندگی کے لئے دو الفاظ آئے ہیں' ایک عاجلہ اور ایک دُنیا۔ دُنیا ادنیٰ کا مؤنث ہے' یعنی بہت قریب' جبکہ عاجلہ جلدی والی شے۔ ہماری دُنیوی زندگی تھوڑی ہے اور سامنے موجود ہے' اس کا نفع بھی نقد اور نقصان بھی فوری ہوتا ہے۔اس کی مسرت بھی محسوس ہوتی ہے اور مضرت بھی۔اس لئے

یہ عاجلہ ہے۔ یہ قریب ہے' اس لئے دُنیا کہلاتی ہے۔ وہ آخرت ہے' کیونکہ بظاہر وہ دُور ہے اور دُنیا سے تو بہرحال دُور ہے ہی۔

عام طور پر یہ مضمون اس طرح سے بیان ہوا ہے کہ جو دُنیا کا طالب ہو ہم اسے اس میں سے دے دیتے ہیں' مگر اس مقام پر دو چیزیں مزید واضح کی گئی ہیں کہ دُنیا کے طالبین میں سے بھی ہم جس کو چاہیں گے دیں گے اور پھر جتنا چاہیں گے دیں گے۔ ایک شخص کروڑ پتی بننا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ نہیں کیا کہ اسے ضرور کروڑ پتی بنا دیں گے۔ ہوسکتا ہے ایک شخص ساری عمر طالب دُنیا بن کر جوتیاں چٹخاتا رہے' پوری کوشش بھی کرے' تمام توانائیاں بھی صرف کر دے' مگر ساری عمر کی جدوجہد کے بعد بھی اسے حرمان اور یاس کے سوا کچھ نہ ملے۔ کیونکہ یہاں الفاظ ہیں ﴿مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ﴾ یعنی جس کو چاہیں گے دیں گے' اور کتنا دیں گے یہ بھی ہماری مشیت کے تابع ہے۔ بات واضح ہو گئی کہ طالب دُنیا کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ دو اختیارات خصوصی طور پر محفوظ رکھے ہیں۔ دوسری آیات میں یہ بات وضاحت کے ساتھ نہ تھی۔ ان آیات میں ارتقاء اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ البتہ آخری بات بالکل قطعی ہے ﴿ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ﴾ ''پھر ہم اس کا ٹھکانہ جہنم بنا دیں گے''۔ ﴿يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝﴾ ''جس میں وہ داخل ہوگا مذمت زدہ ہو کر اور دھکے کھا کر''۔

اس سے پہلے یہ بات صرف منفی اسلوب میں آئی تھی' یعنی ﴿وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝﴾ یا ﴿وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝﴾ کہ آخرت میں طالب دُنیا کا کوئی حصہ نہ ہوگا' اسے وہاں کچھ نہیں ملے گا۔ یہاں بات اپنی منطقی انتہا کو پہنچ گئی کہ صرف یہ نہیں کہ کچھ ملے گا نہیں' بلکہ سزا ملے گی اور جہنم میں جھونکا جائے گا۔ یہاں بھی دو چیزوں کا اضافہ کیا گیا: ﴿مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝﴾ یعنی وہ شخص مذمت زدہ اور ملامت زدہ ہوگا۔ اس پر چارج شیٹ لگا دی جائے گی' برسرعام رسوا کیا جائے گا کہ یہ ہیں اس کے کرتوت۔ بظاہر دُنیا میں کیا لبادہ اوڑھے پھرتا تھا' حالانکہ اس کی حقیقت یہ تھی۔ تو مذمت زدہ ہو کر اور رحمت سے محروم' دھکیلا ہوا جہنم میں داخل ہوگا۔

اب اس کا تقابل کیجئے۔ سورۃ الشوریٰ میں ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ﴾ تھا' یہاں ﴿مَنْ اَرَادَ الْاٰخِـــرَةَ﴾ ہے۔ یہاں فعل ماضی ہے۔ عربی زبان میں فعل ماضی جہاں ماضی پر دلالت کرتا ہے وہاں قطعیت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ یہاں فعل ماضی لانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات فیصلہ کن ہونی چاہئے کہ وہ واقعتاً طالب آخرت بن گیا ہے اور پوری یکسوئی' عزم بالجزم کے ساتھ فیصلہ کر لیا ہے کہ میرا مطلوب آخرت ہے۔ غور کریں تو یہاں پھر دو شرطیں ہیں۔ اوّل ﴿وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا﴾ ''پھر اس کے لئے محنت کی جتنی محنت اس کے لئے کی جانی چاہئے۔'' یعنی عام سی محنت نہیں۔ آخرت خود عام سی شے نہیں' بلکہ انتہائی قیمتی چیز ہے' پس اس کے لئے محنت بھی اسی درجے کی ہونی چاہئے۔ یہاں لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ﴿وَهُـوَ مُـؤْمِـنٌ﴾ ''اور وہ مؤمن بھی ہو''۔ یعنی وہ یقین رکھتا ہو' اس کا ایمان احتساب والا ہو۔ اس کا عمل رسمی قسم کا نہ ہو' بلکہ ٹھوس اور جاندار ہو۔ وہ شعوری طور پر یہ سمجھ رہا ہو کہ یہ کام آخرت کے اجر و ثواب کے لئے کر رہا ہے اور نتیجہ کے طور پر ظاہر والے دُنیاوی ردّعمل سے بے نیاز ہے۔ تو آپ نے دیکھا کہ سعی و جہد اور ایمان و یقین کی شرائط کے ساتھ بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ آگے فرمایا: ﴿فَـاُولٰـٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝﴾ ''پس یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوشش کو شرفِ قبولیت نصیب ہوگا''۔ جس کی محنت کو اللہ تعالیٰ قبول فرمالے اُس کی قسمت کے کیا کہنے! اسے وہ کچھ ملے گا کہ ((مَـا لَا عَيْـنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَـمِـعَتْ وَمَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ)) ''نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا خیال تک وارد ہوا''۔ یعنی وہ نعمتیں بے نظیر اور بے مثال ہوں گی۔

اب دیکھئے اگلی آیت: ﴿كُلًّا نُّـمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ﴾ ''ہم ہر ایک کو' اِن کو بھی اور اُن کو بھی اس دُنیا میں تو مدد دیتے ہیں' یہ تیرے پروردگار کی طرف سے عطا ہے''۔ اس دُنیا میں مشیت خداوندی یہ ہے کہ بلا امتیاز کافر کو بھی ملے گا اور مؤمن کو بھی ملے گا' بلکہ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ دشمن خدا دُنیاوی نعمتوں سے مالا مال

ہوتے ہیں اور مؤمنین صادقین محروم و مجبور۔ ایسے میں کوئی صاحب ایمان تعجب میں پڑ جاتا ہے کہ ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر!

لیکن ہمارے پیمانے بہت چھوٹے ہیں' اللہ کا پیمانہ بہت بڑا ہے۔ جیسے اس کا زمان کا پیمانہ بڑا ہے کہ ایک دن ۵۰ ہزار برس کا' اسی طرح اس کے دوسرے پیمانے بھی بہت بڑے ہیں۔ ہمارے پیمانوں کا ناپ تول صرف اس دُنیا کی حد تک ہے' ورنہ اس کی وقعت ہی کیا ہے! حدیث شریف میں مذکور ہے کہ ''اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس دُنیا کی قدر و قیمت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کسی کافر کو یہاں سے ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا''۔ مگر یہ تو بالکل حقیر' بے قدر و قیمت اور بے حقیقت شے ہے۔ لہٰذا اللہ نے دسترخوان بچھا دیا ہے کہ کافر بھی کھائے مؤمن بھی کھائے۔ بلکہ اہل ایمان کے لئے تو اس کی طرف سے اکثر ابتلاء و آزمائش کا معاملہ ہوتا ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (البقرۃ : ۱۵۵)

''اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں کسی ایک چیز کے ساتھ' یعنی خوف اور بھوک اور کمی کرنے سے (تمہارے) مالوں اور جانوں اور پھلوں میں۔ اور خوشخبری سنائیے ان صبر کرنے والوں کو''۔

تو اکثر اوقات اہل ایمان کے لئے بھوک آزمائش کے طور پر اور بلندئ درجات کے لئے آئے گی' مگر کافروں کے لئے دروازہ کھلا ہے اور ربّ کا دسترخوان وسیع ہے۔ پھر فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾ ''اور نہیں ہے بخشش تیرے پروردگار کی کسی پر بند کی گئی''۔ آیت کے اس ٹکڑے میں اس خیال کا ردّ کیا جا رہا ہے کہ جو کسی مبتلائے مصیبت مسلمان کو کسی دشمن خدا کی خوشحالی اور آسودگی کو دیکھ کر آ سکتا ہے کہ اللہ نے اس کے لئے کیوں راحت اور آسائش کا دروازہ کھول رکھا ہے۔ تو بات واضح ہوئی کہ اللہ کی یہ دُنیاوی نعمتیں ایسی ہیں کہ یہ کسی قسم کے لوگوں پر بھی بند نہیں کی گئیں بلکہ اس

کا دستر خوان تو بڑا وسیع اور پھیلا ہوا ہے۔ اگلی آیت دیکھئے:

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا۝﴾

''دیکھو! کیسی بزرگی دی ہے ہم نے بعض کو بعض پر، اور آخرت باعتبار درجوں کے سب سے بڑی اور باعتبار فضل و کرم سب سے اعلیٰ ہے''۔

تو دُنیا میں جو فضیلت اللہ نے بعض کو بعض پر دی ہے وہ معنوی بھی ہے اور مادی اشیاء میں بھی ہے۔ کسی کو مال زیادہ دے دیا ہے تو کوئی تنگ دست ہے۔ کسی کو ذہانت زیادہ دے دی تو کوئی غبی ہے۔ کسی کو خوبصورت بنا دیا ہے تو کوئی بدصورت ہے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ نے درجات رکھے ہیں۔ پھر ذکر آیا آخرت کا ﴿وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا۝﴾ ''اور آخرت تو درجات کے لحاظ سے بھی بہت بڑی ہے اور فضائل کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے''۔ آخرت میں جو فرقِ مراتب ہوگا اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک ادنیٰ درجے کا جنتی اپنے سے بلند تر درجے کے جنتی کو ایسے دیکھے گا جیسے تم زمین پر بیٹھ کر ستاروں کو دیکھتے ہو۔ جنت میں درجات کا فرق و تفاوت اس قدر ہوگا۔ دُنیا کے پیمانے اگرچہ بہت محدود ہیں، مگر ہمیں یہیں کا فرق بہت زیادہ لگتا ہے۔ کوئی کروڑ پتی ہے اور کوئی مفلس و قلاش۔ تو جہاں کا فرقِ مراتب بے حد و حساب ہوگا وہاں کی کیفیت کا کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے!

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم یکسوئی اور ایمان داری کے ساتھ سوچیں، فرصت نکال کر اپنا جائزہ لیں، دروں بینی کریں، اپنے اپنے گریبان میں جھانکیں اور دیکھیں کہ ہماری ترجیحات کیا ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بعض وقتی محرکات کے تحت تو کچھ عمل کر لیا، لیکن دل میں دُنیا ہی بسی ہوئی ہے، ہماری نگاہوں میں دُنیا کی نعمتوں اور آسائشوں ہی کی قدر و منزلت ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ لمحہ فکریہ ہے۔ متنبہ ہو کر ہمیں شعوری طور پر فیصلہ کرنا چاہئے کہ ہمیں طالب آخرت بننا ہے، طالب دُنیا نہیں! دُنیا میں اللہ تعالیٰ جتنا دے اس کا شکر ادا کریں کہ وہ اس کا فضل اور اس کی دین ہے۔

ہدایتِ قرآنی سے محرومی کا ایک اہم سبب

اس سے پہلے اس بات کا تفصیلاً ذکر ہو چکا کہ انسان کے عملی رویئے اس کے کردار اور اس کے اخلاق پر سب سے زیادہ گہرا اثر آخرت پر ایمان و یقین ہی سے مترتب ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے اس سلسلہ میں ایک اور حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ انسان کا قرآن مجید کی ہدایت سے محروم ہونے کا سب سے بڑا سبب بھی ایمان بالآخرۃ سے دوری اور اعراض ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۞ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا﴾ (بنی اسرائیل : ٤٥-٤٦)

''اور (اے نبی ﷺ!) جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر ایسا غلاف چڑھا دیتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے' اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں''۔

یہ حقیقت تو محتاجِ بیان نہیں کہ آنحضرت ﷺ کا فرضِ منصبی تذکیر بالقرآن تھا۔ آپؐ کی دعوت کا اصل مرکز و محور قرآن مجید ہی تھا۔ حضور ﷺ کی دعوت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ آخرت پر یقین کا نہ ہونا ہے۔ جب آخرت پر یقین نہیں تو لاابالی پن پیدا ہوگا' بے پرواہی ہوگی' پھر انسان کیوں غور سے سنے گا اور کیوں متوجہ ہوگا؟ مذکورہ بالا آیات میں اسی لئے فرمایا کہ جب آپ اُن کو قرآن سناتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے تو ہم آپ کے اور اُن کے درمیان ایک غیر مرئی پردہ حائل کر دیتے ہیں' ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیتے ہیں اور ان کے کانوں میں بوجھ پیدا کر دیتے ہیں کہ نہ یہ سن سکیں اور نہ سمجھ سکیں۔ اس طرح وہ قرآن کی ہدایت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بالآخرۃ کا فقدان نہ صرف عملی رویئے اور کردار کو متاثر کرتا ہے بلکہ وہ انسان کو قرآن جیسی دولت' جو کہ ذریعہ ہدایت ہے' کی اثر

پذیری سے بھی محروم رکھتا ہے۔

انکارِ آخرت کی مختلف صورتیں

آخرت پر ایمان سے محرومی کے تین بنیادی درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ سرے سے انکار ہو کہ ہم موت کے بعد کے حالات کو تسلیم نہیں کرتے۔ دوسرا درجہ یہ کہ نہ انکار ہے نہ اقرار۔ یہ بین بین کی کیفیت ہے کہ صاف انکار بھی نہیں اور صاف اقرار بھی نہیں۔ تصدیق قلبی بھی نہیں اور دل کا ٹھکنا بھی نہیں۔ تیسرا درجہ انکار مع الاقرار ہے۔ اور یہ صورت حال بڑی اہم ہے کہ ہم اسے پہچانیں۔ بظاہر مان رہے ہیں لیکن حقیقت میں نہیں مان رہے' یا یوں کہئے کہ اقرار نما انکار ہے۔

وقوعِ قیامت کو ناممکن سمجھنا

اب ان تینوں صورتوں کی کیفیت پر غور کیجئے۔ صاف انکار کے سلسلے میں قرآن میں دو طرح سے بات کی گئی ہے' ایک منفی انداز میں اور دوسرے مثبت انداز میں۔ اکثر لوگ تو مرنے کے بعد جی اٹھنے کو بعید الوقوع اور ناممکن سمجھتے تھے' وہ کہتے تھے کہ ہم مر جائیں گے' ہماری ہڈیاں گل سڑ جائیں گی' ہمارے جسم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور یہ ریزے دُور دراز بکھر جائیں گے' کیا اس کے بعد بھی ہمیں زندہ کر دیا جائے گا؟ ﴿هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۞﴾ ''دُور ہے' دُور ہے جس کا وعدہ تم دیئے جاتے ہو''۔ قرآن مجید میں اکثر جگہ لوگوں کے اسی طرزِ عمل کا ذکر ہے۔ اس میں ایک بات یہ بھی قابل توجہ ہے کہ یہ لوگ مثبت انداز میں ایمان بالآخرۃ کی نفی نہیں کر رہے' بلکہ اس کے وقوع کو ناممکن سمجھ رہے ہیں کہ وہ کیسے ہوگا۔ تو قرآن مجید اس کا جواب دیتے ہوئے اللہ کی صفت قدرت کو نمایاں کرتا ہے کہ تم اللہ کو مانتے ہو تو سوچو کہ اللہ قادر مطلق ہے یا عاجز ولاچار؟ اگر قادر مطلق اللہ کو مانتے ہو تو تمہارا استبعاد منطقی طور پر ختم ہو گیا کہ وہ ''عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ'' ہے تو پھر اس کے لئے دوبارہ پیدا کر دینا کوئی بعید نہیں۔ اس کے لئے قرآن شواہد لاتا ہے کہ تم دیکھتے نہیں کہ زمین مُردہ پڑی ہوتی ہے' اللہ

بارش لاتا ہے تو اس میں پھر زندگی ہی زندگی آ جاتی ہے۔ ع ''مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی''۔ مزید یہ کہ تم دیکھتے نہیں کہ تمہاری حیثیت کیا تھی؟ یہی نا کہ گندے پانی کی ایک بوند ﴿لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا ﴾ جس کا تذکرہ بھی انسان پسند نہیں کرتا تو جس نے گندے پانی کی ایک بوند سے سنتا دیکھتا خوبصورت انسان بنا کر کھڑا کر دیا کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر دے؟ ﴿اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰى اَنْ يُّحْيِىَ الْمَوْتٰى ۞﴾

فلسفہ دہریت

لیکن صاف انکار کا ایک مثبت انداز بھی ہے وہ یہ کہ ہم کسی اور زندگی کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر مضمون مختلف جگہوں پر تدریجی ارتقاء کرتے ہوئے نقطۂ عروج (Climax) تک پہنچتا ہے۔ اسی کی ایک مثال اس مضمون کے ضمن میں دیکھئے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۲۹ میں ہے:

﴿وَقَالُوْا اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۞﴾

''اور انہوں نے کہا نہیں ہے مگر ہماری یہی دُنیا کی زندگی' اور ہم ہرگز دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں ہیں''۔

یہ مثبت انداز میں انکار ہے۔ یہاں بھی صریح انکار ہے' مگر اس پہلو سے نہیں کہ یہ مشکل ہے' کیسے ہوگا؟ بلکہ ایسے کہ یہ ہے ہی نہیں۔ یہ انکار ایک باقاعدہ فلسفہ اور نظریہ ہے۔ یہی مضمون ذرا ارتقائی صورت میں سورۃ المؤمنون کی آیت ۳۷ میں ملے گا:

﴿اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۞﴾

اس آیت میں ابتدائی اور آخری الفاظ سورۃ الانعام کی مذکورہ بالا آیت ہی کے ہیں' البتہ یہاں درمیانی ٹکڑا بڑھ گیا ہے: ﴿نَمُوْتُ وَنَحْيَا ﴾ ''ہم خود مرتے اور خود جیتے ہیں''۔ اس میں صرف آخرت کا انکار نہیں خدا کا بھی انکار ہے کہ ہمیں مارنے اور جلانے والی کوئی اور ہستی نہیں ہے' بلکہ ہم خود مرتے اور جیتے ہیں۔ بظاہر صریح نہیں لیکن اس فعل کی نسبت اپنی طرف ہے' جبکہ صحیح ایمان یہ ہے کہ ﴿يُحْيِىْ وَيُمِيْتُ ﴾ کہ وہ ہمیں

زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ یہ الفاظ سورۃ الحدید کی ابتدا میں اور اس کے علاوہ بہت سے دوسرے مقامات پر بھی آئے ہیں۔

اب اس مضمون کا نقطۂ عروج سورۃ الجاثیہ کی آیت ۲۴ میں دیکھئے:

﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾

''اور انہوں نے کہا نہیں ہے مگر ہماری یہی دُنیا کی زندگی' ہم مرتے ہیں اور ہم جیتے ہیں اور نہیں ہلاک کرتا ہم کو مگر زمانہ''۔

یہاں یہ مضمون پورے فلسفہ دہریت کی صورت میں آیا ہے کہ خدا اور آخرت کا انکار ہے۔ یہ خالص مادہ پرستانہ فلسفہ ہے جو اس دور میں عام ہے اور ذہنوں میں اس کی جڑیں بڑی گہری اتری ہوئی ہیں۔

اب غور کیجئے سورۃ المؤمنون میں تھا: ﴿نَمُوْتُ وَنَحْيَا﴾ ''ہم مرتے ہیں اور ہم جیتے ہیں''۔ یہاں سوال پیدا ہوگا کہ کون مارتا ہے؟ کیا شے ہے جس سے موت آتی ہے؟ اگر یہ ہمارا اختیار ہے تو ہم تو جینا ہی چاہیں گے۔ سورۃ البقرۃ میں الفاظ آئے ہیں: ﴿يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ ''ان میں سے ہر ایک کی خواہش ہے کہ اس کی عمر ہزار برس ہو جائے''۔ اگر خود مرنا نہیں چاہتے تو پھر کوئی تو ہے جو انسان کو مارتا ہے یا مرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر وہ خدا نہیں ہے تو کون ہے؟ اب اس کا جواب دے کر فلسفے کو مکمل کر دیا کہ ہمیں ہلاک نہیں کرتا مگر گردش زمانہ' گردش روزگار! یہ دہریت کی مکمل صورت ہو گئی کہ خدا اور آخرت دونوں کا انکار ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فلسفہ دہریت کو اس ایک آیت میں سمو کر پیش کر دیا۔ یاد رکھئے کہ فلسفہ دہریت اور انکارِ خدا و آخرت پر مبنی تمام ازم کوئی آج کی بات نہیں' نزولِ قرآن کے وقت بھی ایسے لوگ موجود تھے اگرچہ بہت ہی کم تعداد میں تھے۔

انکار اور اقرار کی درمیانی کیفیت

آخرت پر ایمان سے محرومی کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ نہ انکار ہے نہ اقرار۔ اس کی بھی دو شکلیں قرآن مجید میں سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ شکل ہے جو انکار سے قریب تر

ہے اور ایک وہ شکل ہے جو اقرار سے قریب تر ہے۔ انکار سے قریب تر صورت کے لئے دیکھئے سورۃ الکہف کی آیت ۳۶ جہاں ایک مادہ پرست شخص کا ذکر ہے[1] جو دُنیا کی آسائشوں میں بدمست کہتا ہے:

﴿وَمَا اَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا﴾

''اور میں نہیں گمان کرتا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے' اور اگر میں لوٹایا گیا اپنے رب کی طرف تو میں پاؤں گا اس سے بہتر جگہ پھر جانے کی۔''

یوں پہلی بات جو وہ کہہ رہا ہے یہ ہے کہ میرا نہیں خیال کہ کوئی قیامت ویامت ہونے والی ہے' مجھے تو یہ ڈھکوسلہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا انکار زوردار نہیں بلکہ وہ ظن کا لفظ استعمال کر رہا ہے۔ اسی لئے وہ ساتھ ہی کہتا ہے کہ اگر ایسا ہوا بھی اور مجھے میرے ربّ کی طرف لوٹا گیا تو وہاں مجھے بہت خیر ملے گی۔ جس ربّ نے مجھے دُنیا میں نعمتیں دی ہیں وہ مجھے وہاں بھی دے گا۔ معلوم ہوا وہ ربّ کا منکر نہیں' بلکہ ربّ کو مانتا ہے۔ وہ انکارِ آخرت بھی پورے جزم کے ساتھ نہیں کر رہا بلکہ گمان کرتا ہے۔ تو یہ ہے ایسا گمان کہ انکار سے قریب تر ہے۔

اسی طرح ایک گمان وہ ہے جو اقرار سے قریب تر ہے۔ اس کا ذکر سورۃ الجاثیہ کی آیت ۳۲ میں آیا ہے:

﴿مَا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ﴾

''ہم نہیں جانتے یہ قیامت کیا ہے' اگرچہ ہمیں گمان سا تو ہوتا ہے لیکن ہمیں اس پر یقین نہیں ہے''۔

دیکھئے یہاں انکار کا پہلو مضبوط ہے اور اقرار صرف گمان کی حد تک ہے' وہ بھی اس لئے کہ نیکی کا بدلہ جزا کی صورت میں اور برائی کا بدلہ سزا کی صورت میں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ البتہ یقین کی حد تک وہ اسے ماننے کو تیار نہیں۔

برا نہ مانئے' ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں تو اکثریت کا ایمان

(۱) یاد رہے شخصیت پرستی کی طرح مادہ پرستی بھی ہمارے اس دور کا سب سے بڑا شرک ہے۔

بالآخرت کا معاملہ اس سے آگے نہیں کہ قرآن میں اتنی بار پڑھا ہے' مولوی لوگ اتنا کچھ کہتے ہیں' احادیث میں کثرت سے ذکر ہے تو کچھ گمان سا تو ہوتا ہے۔ آخرت کی زندگی کے بارے میں قرآن و حدیث کے بیانات بڑے واضح اور دلائل منطقی اور وزنی ہیں۔ اعمال کا بدلہ تو ہونا چاہئے ﴿اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی ﴾ انسان کو ایسے ہی تو نہیں چھوٹ جانا چاہئے کہ ظلم بھی کرے' خون بھی چوسے' حرام خوریاں بھی کرے اور پھر اس کا کوئی محاسبہ نہ ہو۔ پھر ایک شخص نیکی کے لئے پوری توانائیاں لگا دے جس کی سب سے بڑی مثال خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ انہوں نے اپنے اور اپنی اولاد کے لئے کیا حاصل کیا؟ اختیاری فقر اپنے اور اپنے گھر والوں پر جبراً نافذ رکھا۔ ازواجِ مطہرات نے تو کہا تھا کہ ہمارا نان و نفقہ بڑھنا چاہئے لیکن حضور ﷺ نے صاف کہہ دیا کہ اگر تم میرا اختیاری فقر اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں تو پھر میرے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ پھر میں آپ کو دُنیا کا مال و اسباب دے کے گھر سے رخصت کر دیتا ہوں۔ (۱) تو اُمہات المؤمنین نے اس اختیاری فقر کو خوش دلی کے ساتھ قبول کیا اور ساری زندگی آپؐ کے بیت اطہر میں دُنیاوی خوشحالی نام کی کوئی چیز کبھی نہیں دیکھی گئی۔ یوں سمجھئے کہ آپؐ نے اپنی تمام تر صلاحیتوں سے دُنیا میں اپنے لئے کچھ بھی نہیں بنایا۔ اب اگر آخرت کا وجود نہیں ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے گھاٹے میں تو (معاذ اللہ) محمد رسول اللہ ﷺ رہے کہ دُنیا میں کچھ بھی نہ ملا اور آخرت میں بھی کچھ حاصل نہ ہوگا! ایسی بات ہرگز نہیں۔ ہماری اکثریت کا حال یہ ہے کہ مانتے ہیں کہ دلیل عقلی تو بہت مضبوط ہے مگر ﴿مَا نَحۡنُ بِمُسۡتَیۡقِنِیۡنَ﴾ دل نہیں ٹھکتا' یقین کی کیفیت نہیں۔ اور جان لیجئے کہ آخرت پر جب تک یقین نہ ہو عمل پر اس کا اثر مترتب نہیں ہوتا' کیونکہ دُنیا نقد ہے۔ مثل ہے ''نو نقد نہ تیرہ ادھار''۔ دُنیا میں تو یہ عقلمندی ہے کہ ادھار کے تیرہ چھوڑ کر نقد کے نو لے لو' کیونکہ پتہ نہیں تیرہ ملیں یا نہ ملیں۔ تو نقد وہی چھوڑے گا جس کا یقین ادھار پر ہوگا۔ پس آخرت کا ادنیٰ اقرار یا ظن عمل پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ یہ

(۱) دیکھئے سورۃ الاحزاب آیت ۲۸'۲۹

اسی وقت اثر انداز ہوگا جب آخرت پر پورا پورا یقین ہو۔

پہلے ذکر ہو چکا کہ انسان کے عملی رویئے' کردار اور اخلاق پر سب سے زیادہ گہرا اثر آخرت پر ایمان ویقین کا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کا قرآن مجید کی ہدایت سے محروم ہونے کا بھی سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ پھر آخرت پر ایمان سے محرومی کے تین درجات کا ذکر ہوا۔ پہلے وقوع آخرت سے صاف انکار' دوسرے نہ انکار نہ اقرار' نہ صاف طور پر اقرار اور نہ کھل کر انکار' اور تیسرے اقرار کرتے ہوئے انکار یا انکار مع الاقرار یا اقرار نما انکار۔ پہلے دو درجات کا تو تفصیل سے بیان ہو چکا' اب یہاں تیسرے درجے کا ذکر ہوتا ہے۔

آخرت پر ایمان سے محرومی کا تیسرا درجہ جسے انکار مع الاقرار کہا جا سکتا ہے' سب سے زیادہ خوفناک اور خطرناک ہے۔ مانتے ہیں کہ آخرت ہوگی' بعث بعد الموت اور حساب کتاب ہوگا' سب کچھ ہوگا' ذرے ذرے کا حساب ہوگا —— لیکن! اب اس ''لیکن'' کی تین شکلیں ذہن میں رکھئے اور ہر شکل کی دو دو صورتیں —— تو اس طرح چھ باتیں اس ضمن میں بیان ہوں گی۔

شفاعت باطلہ کا تصور

پہلا ''لیکن'' یہ ہے کہ آخرت کا وقوع تو برحق ہے' لیکن وہاں ہمارے سفارشی موجود ہیں' وہ ہمیں بچالیں گے' ہماری مدد کریں گے۔ اگر ایمان بالآخرۃ کا یہ تصور ہے تو آخرت کا ماننا نہ ماننا برابر ہوگا۔ جیسے مثال ہے کہ ''سیاں بنے کوتوال تو ڈر کس کا؟'' اگر کوئی یہ سمجھتا ہو کہ کوئی بڑا چوہدری بچانے والا ہے جو مجھے چھڑا لے گا تو پولیس' تھانے اور عدالت کا ڈر سب کچھ اوپر سے ہٹ جاتا ہے۔ یہ ہے وہ انقلابی نظریہ جو آخرت کے ماننے کو نہ ماننے میں بدل دیتا ہے' ماننا بالکل اسی طرح بے اثر ہو جاتا ہے کہ ایک اچھی بھلی رقم کو صفر سے ضرب دیں تو وہ صفر ہو جائے گی۔ جہاں یہ تصور ہوگا وہاں ایمان بالآخرۃ صفر کے درجے میں ہوگا۔

اب اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ان لوگوں میں پیدا ہوئی جو کھلم کھلا مشرک تھے اور ان کے اپنے گھڑے ہوئے معبود تھے۔ یہ ان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اصل میں تو یہ دیوتاؤں اور دیویوں کا تصور ایمان بالملائکہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مشرکین مکّہ نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر ان کی مورتیاں بنالی تھیں' وہ کہتے تھے ﴿هٰـؤُلَآءِ شُفَعَاؤُنَا عِـنْـدَ اللّٰـهِ ﴾ ''یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں''۔ اسی لئے ہم ان کو پوجتے ہیں' چڑھاوے چڑھاتے اور خوشامدیں کرتے ہیں تاکہ یہ خوش ہو جائیں۔ جب یہ خوش ہو جائیں گے تو خدا کے ہاں ہمیں بچالیں گے۔ پس یہ تصور تو کھلم کھلا مشرکین کا ہے۔ اصل شے تو فسادِ خون ہے جو کبھی یہاں نکل آیا کبھی وہاں نکل آیا۔ ہمارے ہاں بھی سفارشی اور بچانے والوں کا تصور موجود ہے۔ مسلمانوں میں کثرت سے ایسے لوگ ہیں جو دیگر ایمانیات کے ساتھ ساتھ ایمان بالآخرۃ کے بھی قائل ہیں مگر ان کے ہاں بھی شفاعت باطلہ کا عقیدہ موجود ہے کہ جتنے مرضی گناہ ہوں' نافرمانیاں ہوں' انبیاء اللہ اور مقربین بارگاہِ خداوندی ہماری شفاعت کریں گے اور ہم کچھ بھی سزا نہ پائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ شفاعت کا تصور خود قرآن میں موجود ہے' مگر شفاعت باطلہ اور شفاعت حقہ میں ایک بہت ہی باریک سا فرق ہے جو اگر ملحوظ خاطر رہے تو انسان کے قدم راہ راست سے نہیں ہٹتے۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ انبیاء و اولیاء کی شفاعت باذن اللہ ہوگی' پھر اس کے حق میں ہوگی جس کے حق میں اللہ چاہے گا۔ یہ شفاعت اللہ کے فیصلے کو تبدیل کرانے والی نہیں ہے۔ مخلوق میں سے کسی کا زور نہیں ہے کہ وہ اللہ کے فیصلے کے آگے دم مارے اور خدا کی مشیت کے خلاف شفاعت کے لئے زبان کھولے۔ پس شفاعت حقہ اور شفاعت باطلہ کے درمیان یہ باریک سا فرق ملحوظ خاطر نہ رہے تو انسان کا قدم ڈگمگاتا ہے اور وہ شفاعت باطلہ کی دلدل کے اندر جا گرتا ہے اور پھر وہی صورت پیدا ہو جاتی ہے جو مشرکین کے معبودوں کی۔ پھر انبیاء و اولیاء' صالحین اور اتقیاء کے بارے میں بالکل اسی طرح کے تصورات ذہن میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو آخرت پر ایمان بے معنی ہو گیا۔

''.......لیکن ترے محبوب کی اُمت میں ہیں!''

دوسرا ''لیکن'' یہ ہے کہ کسی نسب یا نسبت کی بنا پر یہ سمجھ لینا کہ ہم تو بخشے بخشائے ہیں' آخرت واقع تو ہوگی' حساب کتاب بھی ہوگا' مگر ہمارا نہیں۔ اور اگر ہمارا ہوا بھی تو صرف دوسروں کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے لئے یا پھر قانونی تقاضے پورے کرنے کے لئے' ورنہ ہم تو بخشے بخشائے ہیں۔ اس طرزِ عمل کی ایک بنیاد یہ ہے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں' خلیل اللہ کے ساتھ ہمارا نسبی تعلق ہے' تو پھر کیوں ہمارا حساب کتاب ہوگا؟ ﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ ہمیں تو آگ چھو ہی نہیں سکتی' ہاں اگر بہت ہوا تو چند دن کی بات ہوگی۔ وہ بھی لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ بڑی طرف داری ہوگئی' ورنہ ہم تو ہرگز آگ میں نہ ڈالے جائیں گے' یہ آگ اور عذاب سب کچھ دوسروں کے لئے ہے۔ یہود میں یہ عقیدہ بڑی شدت کے ساتھ موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو خدا کے پسندیدہ اور چہیتے ہیں۔ باقی یہ عیسائی وغیرہ گھٹیا قسم کی مخلوق ہیں' ان کے ساتھ یہ معاملات ہوں گے' وہ جہنم میں پڑیں گے۔

اسی طرح کچھ لوگ نسبت کی بنیاد پر زعمِ باطل میں مبتلا ہیں کہ ہمارا تعلق فلاں گروپ سے ہے' فلاں اُمت سے ہے' ہم اُمتِ مرحومہ میں سے ہیں۔ کیا ہوا اگر شرابی ہیں' زانی ہیں' چور اچکے یا ڈاکو ہیں' قاتل ہیں' دین کا حلیہ بگاڑنے والے ہیں ـــــ لیکن ہیں تو محبوبِ خدا کی امت۔ ع کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی اُمت میں ہیں! سمجھ لیجئے کہ یہ لیکن بہت بڑا لیکن ہے' یہ پورے عقیدے کو صفر سے ضرب دینے والی بات ہے۔ گویا میزانِ عمل اور جزا و سزا سب برحق' لیکن اتنی بڑی نسبت اس سے مستثنیٰ قرار دینے کے لئے بہت کافی ہے۔ درحقیقت یہ وہ دوغلی نسبت ہے جس کی قرآن کریم میں نفی کی گئی ہے۔ دیکھئے سورۃ البقرہ کی آیت ۶۲:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝﴾

''یقیناً جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور جو عیسائی اور صابی ہوئے' (ان میں سے) جو بھی اللہ اور روزِ آخر پر ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے اُن کا اجر اُن کے ربّ کے پاس ہے' اور ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے''۔

غضب خدا کا کہ کچھ لوگوں نے اس آیت کو ایمان بالرسالت و نبوت کی نفی پر محمول کیا ہے' حالانکہ اس میں نفی گروہی نسبت کی کی گئی ہے کہ وہاں فیصلے گروہی نسبت پر نہیں ہوں گے کہ یہ فلاں کی اُمت ہے اسے لے جاؤ جنت میں' اور یہ فلاں کے ماننے والے ہیں' یہ حساب کتاب سے مستثنیٰ ہیں۔ نہیں' بلکہ وہاں تو ہر شخص فرد کی حیثیت میں خدا کی عدالت میں حاضر ہوگا ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴾ قیامت کے دن ہر شخص انفرادی طور پر (حساب کتاب کے لئے) پیش ہوگا۔ یہ ہے فیصلہ کن چیز۔ یہ نہیں کہ تم فلاں کی اُمت تھے یا فلاں گروپ سے منسلک تھے۔ گروہ یا اُمت کی بنیاد پر وہاں فیصلے نہیں ہوں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص بظاہر حضور ﷺ کے ساتھیوں میں شامل ہے' غزوات میں حصہ لے رہا ہے' حتیٰ کہ وہ اسی دوران مارا گیا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ شہادت پائی' مگر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے اسے جہنم میں دیکھا ہے۔ لوگوں نے تعجب کیا تو آپؐ نے وضاحت کر دی کہ اللہ تعالیٰ جب اس سے حساب کتاب لے گا تو وہ کہے گا: اے اللہ میں نے تیری راہ میں جنگ کی اور جان دے دی۔ اللہ فرمائے گا: تو جھوٹ بولتا ہے' تو نے جنگ اس لئے کی تھی کہ تیری شجاعت کا چرچا ہو' پس وہ ہو چکا' اب یہاں تیرے لئے کچھ نہیں ہے اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اسے مُنہ کے بل گھسیٹتے ہوئے جہنم میں لے چلو۔ تو معلوم ہوا کہ اپنا ایمان اور عمل ہی اصل شے ہے' باقی اللہ کا فضل اور اس کا کرم ہے۔ بہر حال کسی قوم' اُمت یا گروہ کے ساتھ وابستگی کی بنیاد پر وہاں فیصلہ نہیں بدلے گا۔

دنیوی آسائشوں کی بنیاد پر آخرت کی امیدیں باندھنا

اب ایک اور ''لیکن'' دیکھئے۔ وہ یہ کہ ہم تو اللہ کے بڑے منظورِ نظر ہیں' بڑے

چہیتے ہیں۔ کس بنیاد پر؟ یہ کہ اس نے ہمیں دُنیا میں دولت دی' وجاہت دی' اقتدار دیا۔ آخر وہ ہمیں پسند کرتا ہے تو اس نے ہم پر یہ سارا کرم کیا ہے' ہمیں ہر طرح کی آسائشوں سے نوازا ہے' لہٰذا ہم اس کے منظورِ نظر ہیں اور یقیناً آگے بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوگا۔ یہی سورۂ کہف کی آیت ۳۶ کا مفہوم ہے' جہاں دُنیاوی نعمتوں میں بدمست ایک شخص کا قول نقل ہوا ہے کہ

﴿وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰی رَبِّیْ لَاَجِدَنَّ خَیْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا﴾

''اگر میں اپنے ربّ کی طرف لوٹایا بھی گیا تو وہاں مجھے اس سے بھی زیادہ دیا جائے گا''۔

اللہ نے اسے انگوروں کے دو باغ دے رکھے تھے' باغوں کے گرداگرد کھجور کے گھنے درخت تھے جو آندھی وغیرہ اور دیگر بیرونی مضر اثرات سے باغ کی حفاظت کرتے تھے۔ باغوں میں ابلتے ہوئے چشمے بھی تھے اور کھیتی بھی تھی۔ نیز وہ شخص صاحب اولاد بھی تھا۔ گویا مادّی وسائل اسے خوب خوب میسر تھے۔ اب اس نے اس کو دلیل بنا کر اپنے آپ کو اللہ کا لاڈلا اور چہیتا جان لیا اور سمجھا کہ اللہ کا یہ لاڈ پیار آخرت میں کیونکر ختم ہو جائے گا! اگر میں لاڈلا ہوں تو مجھے وہاں بھی یہ سب کچھ ملے گا۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی تھا جو اللہ کا بندہ تھا' جس کے پاس دولت تھی نہ اقتدار۔ اس نے اُس کو طعنہ دے کر کہا کہ تمہیں اللہ نے جس حال میں یہاں رکھا ہے وہاں بھی تیرا ایسا ہی برا حال ہوگا اور مجھے جیسا یہاں رکھا ہے وہاں بھی ایسا ہی رکھے گا۔ یہی بات ولید بن مغیرہ کے کردار میں نظر آتی ہے۔ دیکھئے سورۃ المدثر میں اس کا پورا نقشہ کھینچا گیا ہے:

﴿ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ۝ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا ۝ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ۝ ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ۝ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا ۝ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝﴾ (آیات ۱۱۔۱۷)

''چھوڑ دو مجھے اور اُس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا' بہت سا مال اس کو دیا' اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیئے' اور اس کے لئے ریاست کی راہ ہموار کی' پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں (دُنیا کے علاوہ آخرت

کی نعمتیں بھی اسے عطا کروں۔) ہرگز نہیں' وہ ہماری آیات سے عناد رکھتا ہے۔
میں تو اسے عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا''۔

ولید بن مغیرہ اللہ پر ایمان کی نفی نہیں کرتا تھا' نہ ہی آخرت کا انکار کرتا تھا' بلکہ وہ دُنیا میں میسر عیش و آرام کو آخرت کے عیش و آرام کی دلیل بنا کر دھوکہ کھا رہا تھا۔ یہاں پھر یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ صورتِ حال انتہائی خوفناک ہے۔

اللہ کی شانِ کریمی سے دھوکا کھانا

اب آیئے آخری ''لیکن'' کی طرف۔ یہ وہ اندازِ فکر ہے جو معرفتِ خداوندی میں ڈوبا ہوا ہے' اس لئے اس سے انسان بڑی آسانی سے دھوکا کھا جاتا ہے۔ آخرت پر ایمان و یقین تو ہے' ظاہر ہے وہاں حساب کتاب بھی ہوگا— ''لیکن اللہ تعالیٰ بڑا غفور ہے' بڑا کریم ہے' بڑا مہربان اور بندہ پرور ہے' ہم اس کے بندے ہیں' کیا وہ ہمیں عذاب دے گا؟ توبہ توبہ' ایسا ہرگز نہیں ہوگا!'' خدا کے بارے میں یہ مغالطہ شیطان بڑی آسانی سے انسان کے ذہن میں اتار دیتا ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ الانفطار کا مرکزی مضمون یہی ہے:

﴿یٰاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ ۞ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ ۞ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ۞ کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ ۞ وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۞ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ ۞ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۞ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۞ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ۞ یَّصْلَوْنَھَا یَوْمَ الدِّیْنِ ۞ وَمَا ھُمْ عَنْھَا بِغَآئِبِیْنَ ۞ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۞ ثُمَّ مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ ۞ یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا ط وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ ۞﴾ (آیات ۶۔۱۹)

''اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اس ربِّ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا جس نے تجھے پیدا کیا' تجھے نک سک سے درست کیا' تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا؟ ہرگز نہیں' بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) تم لوگ جزا و سزا کو جھٹلاتے ہو' حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں' ایسے معزز

کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔ یقیناً نیک لوگ مزے میں ہوں گے اور بے شک بدکار لوگ جہنم میں جائیں گے۔ جزا کے دن وہ اس میں داخل ہوں گے اور اس سے ہرگز غائب نہ ہو سکیں گے۔ اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ ہاں، تمہیں کیا خبر کہ وہ جزا کا دن کیا ہے؟ یہ وہ دن ہے جب کسی شخص کے لئے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہو گا۔ فیصلہ اُس دن بالکل اللہ کے اختیار میں ہو گا''۔

یہ باتیں بظاہر تو بڑی عارفانہ ہیں کہ اللہ بڑا غفور ہے' غفار ہے' ستار ہے......لیکن حقیقت میں انسان اس کو دلیل بنا کر ہدایت کا رستہ بھول جاتا ہے۔ کراماً کاتبین ایسے ہی مقرر نہیں کیئے گئے جو تمہارے ایک ایک عمل کی نگرانی کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ بدلہ مل کر رہے گا۔ اللہ بڑا کریم ہے تو منتقم بھی ہے۔ اس کی دوسری شان بھی ہے جو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے۔

اسی حقیقت کو سورۃ الحدید میں بیان کیا گیا ہے جہاں کسی انسان کے مرضِ نفاق میں مبتلا ہونے میں جو مختلف مراحل آتے ہیں ان کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ میدانِ حشر میں صادق الایمان اور منافقین علیحدہ علیحدہ ہو جائیں گے اور درمیان میں فصیل حائل ہو جائے گی۔ پھر منافقین پکار کر مؤمنین صادقین کو کہیں گے ''کیا دُنیا میں ہم تمہارے ساتھ نہ تھے''؟ وہ جواب دیں گے: ہاں تھے' مگر تم نے اپنی جانوں کو فتنے میں ڈالا اور تم منتظر ہی رہے اور شک میں پڑے رہے اور تمہاری آرزوؤں نے تمہیں فریب دیا' یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور تمہیں بڑے دھوکے باز (شیطان) نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں دھوکے میں رکھا۔ پس آج تم سے کوئی فدیہ نہ لیا جائے گا اور نہ ہی ان لوگوں سے جو کافر ہوئے۔ تمہارا ٹھکانہ آگ ہے''۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم اور شانِ غفاری سے اس قدر جری ہوئے کہ عملاً جزا و سزا کا انکار کر بیٹھے۔

اس آخری شکل میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب ایسے لوگوں سے کہا جائے گا کہ اگر اللہ کے ہاں بخشش ہی بخشش ہے تو خدا کے اوامر و نواہی' اطاعت خدا اور رسول' حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کوتاہی پر جو وعیدیں آئی ہیں وہ کیوں ہیں؟ تو جواب دیتے ہیں

کہ یہ باتیں تو صرف ڈرانے دھمکانے اور خوف دلانے کے لئے ہیں' کیونکہ لوگوں کو صحیح رکھنے کے لئے کچھ دھمکیاں بھی تو ہونی چاہئیں۔ ایسی باتیں عام طور پر اُن ملنگوں میں ملیں گی جو تصوف کو بدنام کرتے پھرتے ہیں۔ اولیاء اللہ اور محققین ایسی خرافات سے بری ہیں۔ پس ہمیں چاہئے کہ مضبوط ایمان و یقین کے ساتھ تقویٰ اختیار کریں' کیونکہ ذرا سا بھی غیر محتاط رویہ شیطان کے دھوکے میں آنے کا باعث بن سکتا ہے۔ ہاں اُسوۂ رسولؐ پر عمل کرتے ہوئے نیکیوں کو اختیار کریں اور برائیوں سے پوری طرح دُور رہنے کی کوشش کریں' اس کے باوجود استغفار کا طریقہ اپنائیں اور خطاؤں کی معافی کے لئے اللہ تعالیٰ سے ہمہ وقت بخشش مانگتے رہیں۔ ایمان بالآخرۃ کے سلسلہ میں غیر محتاط اور ڈھیلا ڈھالا انداز انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات oo

خوش خبری: فہم قرآن میں اِضافے کے لیے فنی کتاب

قواعد زبان قرآن کا دوسرا حصہ شائع ہو گیا ہے

صفحات 948 ، رعایتی قیمت 300 + ڈاک خرچ 50 = کل قیمت 350 روپے

حصہ اول اور حصہ دوم دونوں کی کل رعایتی قیمت مع ڈاک خرچ = 650 روپے

نئے ایڈیشن اور نئی کتابوں کی رعایتی قیمتیں

1	قواعد زبان قرآن حصہ اول (تیسرا ایڈیشن)	خلیل الرحمن چشتی	250 روپے
2	قواعد زبان قرآن (حصہ دوم)	خلیل الرحمن چشتی	300 روپے
3	اسلامی تربیت گائیڈ	محمد خان منہاس، چشتی	40 روپے
4	تزکیہ نفس ، مفہوم ، ماہیت اور عملی تدابیر	محمد خان منہاس، چشتی	50 روپے

تیرہ (13) کتابوں کے مکمل سیٹ کی قیمت مع ڈاک خرچ -/905 روپے ہے

کتابیں وی۔ پی نہیں کی جائیں گی۔ منی آرڈر یا ڈرافٹ پہلے آنا لازمی ہے۔

الفوز اکیڈمی ، اسلام آباد	317, Street 16, F-10/2, Islamabad
Fax : 051 - 22 54 139	Tel: 051- 22 51 933

ذکرِ کثیر سے کیا مراد ہے؟

انجینئر مختار حسین فاروقی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اہل حق کے لئے ذکر کثیر کے اہتمام کا تذکرہ ایک سے زیادہ مرتبہ فرمایا ہے۔ مثلاً:

☆ ﴿كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝﴾ (طٰهٰ: ۳۳٬۳۴)

☆ ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا......﴾ (الشعراء: ۲۲۴-۲۲۷)

☆ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝﴾ (الاحزاب: ۲۱)

☆ ﴿......وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾ (الاحزاب: ۳۵)

☆ ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝﴾ (الاحزاب: ۴۱)

☆ ﴿......وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (الجمعة: ۱۰)

نیز فرمایا:

☆ ﴿......وَمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط﴾ (الحج: ۴۰)

قرآن مجید میں محولہ بالا آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اہل ایمان کا خاص وصف ''ذکر کثیر'' ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس طرح کے اہل ایمان کا بڑا درجہ اور مقام ہے۔ تاہم اصل اہمیت اس کو حاصل ہے کہ ذکر کثیر سے مراد کیا ہے؟ چند ہفتے قبل امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ''ذکر الٰہی کی اقسام اور طریقے'' پر مبسوط خطاب

فرمایا اور ''ذکر'' کے مفہوم کو واضح فرمایا۔ عام مروجہ مذہبی ذہن کا المیہ یہ ہے کہ وہ لفظ ذکر سے ''ذکر کرنا'' ہی مراد لے لیتا ہے اور اس وجہ سے مروجہ طریقے' سلاسل اور ذکر خفی و ذکر جلی کی تفصیلات میں سالک کو لے جاتا ہے۔

قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ اللہ کے اسم کے ساتھ ذکر کا لفظ ''کثیر'' کی صفت کے ساتھ آیا ہے۔ سورۂ حج میں ہے کہ ﴿وَمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ کَثِیْرًا﴾ ''اور مساجد کہ اس میں اللہ کے نام کا 'ذکر' کثرت سے کیا جاتا ہے''۔ صاف ظاہر ہے کہ اوّلاً اللہ کے نام کا ذکر مساجد کے ساتھ اور عبادات سے متعلق کر دیا گیا ہے اور مزید برآں اس آیت میں مساجد کے ساتھ دیگر مذاہب کے عبادت خانوں کو بھی اس قسم کے ذکر کا مرکز گردانا گیا ہے جس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ذکر کی ان خاص اشکال کو (جو اُن میں سے مسنون و ماثور بھی ہوں) زندگی کے عام اشغال کا ایک قلیل جزو ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

زیادہ تفصیل سے گریز کرتے ہوئے ذکر کثیر کے مفہوم کے تعین کے لئے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوب ۲۵ (حصہ ششم) کا حوالہ دیا جاتا ہے' جو کہ آنحضرت نے جناب خواجہ محمد شرف الدین صاحب کو تحریر کیا ہے اور جس کا عنوان ہے:

> ''در بیانِ آنکہ ہر عملے کہ بروفق شریعت غرا کردہ آید داخل ذکر است اگر چہ بیع وشریٰ بود''

یعنی یہ خط اس بیان پر مشتمل ہے کہ ہر وہ عمل جو کہ نورانی شریعت کے موافق کیا جائے وہ ذکر میں داخل ہے اگر چہ وہ عمل خرید و فروخت ہی کیوں نہ ہو۔

عنوان ہی سے یہ بات عیاں ہے کہ ذکر سے مراد کیا ہے اور اس صورت میں ذکر کثیر سے کیا مراد ہوگا۔ خط کا متن اور ترجمہ درج ذیل ہے (شاید کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی جلالت شان ہی کے سامنے کچھ لوگ سر تسلیم خم کر کے اسے عملی طور پر قبول کرلیں)

> ''......ایها الولد ان الفرصة غنیمة و الصحة والفراغ مغتنمان ......
> فینبغی صرف الاوقات الی الذکر الالٰهی جل شانه' علی الدوام

وكل عمل يصدر على وفق الشريعة الغراء فهو داخل في الذكر . وان كان بيعا وشراء 'فينبغي مراعاة الاحكام الشريعة في جميع الحركات والسكنات لتصير كلها ذكرًا' فان الذكر عبارة عن طرد الغفلة' ومتى حصلت مراعاة الاوامر والنواهي في جميع الافعال فقد تيسرت النجاة عن اسر الغفلة عن الامر بالاوامر والناهي عن المناهي وحصل دوام ذكره تعالىٰ "

''...... اے فرزند فرصت غنیمت ست وصحت وفراغ مغتنم ۔ ہموارہ اوقات را بذکر الٰہی جل شانہ مصروف باید ساخت ۔ ہر عملے کہ بروفق شریعت غرا کردہ آید داخل ذکرست' اگرچہ بیع وشریٰ بود ۔ پس در جمیع حرکات وسکنات مراعات احکام شریعہ باید نمود تا آنکہ ہمہ ذکر گردد ۔ چہ ذکر عبارت از طردِ غفلت ست وچوں مراعاتِ اوامر ونواہی در جمیع افعال نمودہ آید از غفلت آمر وناہی آنہا نجاتے میسر شد ودوام ذکر او تعالیٰ حاصل گشت'' ۔

''اے بیٹے (یقیناً) فرصت غنیمت ہے اور تندرستی کے ساتھ فراغت بہت بڑا اثاثہ (خزانہ) ہے ۔ (پس) چاہئے کہ (تمام) اوقات کو اللہ جل شانہ کے ذکر میں کھپا دیا جائے (اس لئے کہ) ہر عمل جو کہ نورانی شریعت (شریعت اسلامی) کے موافق کیا جاتا ہے (وہ) ذکر (ہی) میں داخل ہے اگرچہ (وہ عمل بازار اور منڈی میں) خرید وفروخت (ہی کیوں نہ) ہو ۔ پس ہر (قسم کے) افعال کی انجام دہی میں احکامِ شریعت کی پاسداری لازمی ہے تاکہ تمام کام (افعال' حرکات وسکنات) ذکر شمار ہوں ۔ (اس لئے) کہ ذکر غفلت کے دور ہونے کا نام ہے ۔ اور جب اوامر ونواہی کی پاسداری ہر (قسم کے) افعال میں نمایاں ہوگئی تو (یقیناً اللہ تعالیٰ کی) غفلت سے نجات مل گئی' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہی اوامر کا آمر اور نواہی کا ناہی ہے اور (نتیجتاً) اللہ جل شانہ کے دوام ذکر (کی کیفیت اور مرتبہ) حاصل ہوگیا ۔

(خط ۲۵' دفتر دوم' حصہ ششم وعربی ترجمہ از المنتخبات' مطبوعہ ترکی)

پس ثابت ہوا کہ ذکر کثیر سے مراد پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی کامل اطاعت ہے ۔ یہی ذکر دوام ہے اور یہی ''اُدْخُلُوْا فِي

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

مسلمان کا طرزِ حیات (۲۴)

علامہ ابوبکر الجزائری کی شہرۂ آفاق تالیف

"منہاجُ المُسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب الاداب

چھٹا باب

مخلوق سے تعلق کے آداب

۴۔ خاوند بیوی

خاوند اور بیوی کے باہمی آداب کی حیثیت دو طرفہ حقوق کی ہے۔ یعنی خاوند کے بیوی پر حقوق ہیں اور بیوی کے خاوند پر حقوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ ﴾

(البقرۃ : ۲۲۸)

"اور عورتوں کے لیے حقوق ہیں جس طرح ان پر فرائض ہیں دستور کے مطابق۔ اور مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زوجین میں سے ہر ایک کے ذمہ دوسرے کے حقوق ہیں' البتہ مردوں کو ایک خاص فوقیت حاصل ہے جس میں بہت سے دیگر امور کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا تھا :

((اَلَا اِنَّ لَكُمْ عَلٰى نِسَاءِ كُمْ حَقًّا' وَلِنِسَاءِ كُمْ عَلَيْكُمْ حَقًّا)) (۲۰)

"سنو! تمہاری عورتوں پر تمہارے کچھ حقوق ہیں اور تم پر تمہاری عورتوں کے کچھ حقوق ہیں"۔

ان میں کچھ حقوق تو دونوں کے درمیان مشترک ہیں اور کچھ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ خاص ہیں۔ مشترک حقوق مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ دیانت داری: خاوند اور بیوی کا باہمی معاملہ دیانت داری پر مبنی ہونا چاہیئے۔ وہ کسی معمولی سے معاملے میں بھی خیانت سے کام نہ لیں۔ کیونکہ میاں بیوی کی حیثیت کاروبار کے شراکت داروں کی سی ہے۔ اس لیے انہیں زندگی کے تمام خصوصی اور عمومی معاملات میں دیانت داری' خیر خواہی' سچائی اور اخلاص پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔

۲۔ محبّت و شفقت: ضروری ہے کہ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے زیادہ سے زیادہ پُرخلوص محبّت اور مکمل شفقت و رحمت پائی جائے۔ دونوں زندگی بھر ایک دوسرے سے محبّت و شفقت کا برتاؤ کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ ﴾ (الرُّوم: ۲۱)

"اور اُس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں بنادیں تاکہ تم ان کے ذریعے راحت حاصل کرو' اور تمہارے درمیان محبّت اور شفقت رکھ دی۔"

اور جنابِ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ لَّا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ)) (۲۱)

"جو رحم نہیں کرتا' اس پر رحم نہیں کیا جاتا"۔

۳۔ باہمی اعتماد: دونوں کو ایک دوسرے پر بھرپور اعتماد ہونا چاہیئے۔ کسی کو بھی اپنے شریک حیات کی سچائی' اخلاص اور خیر خواہی میں معمولی سا شک بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ... ﴾ (الحجرات: ۱۰)

"مؤمن (آپس میں) بھائی بھائی ہیں۔"

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) (۲۲)

"تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ

کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے"۔

اور زوجیت کے تعلق سے اخوتِ ایمانی مین قوت اور پختگی ہی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے زوجین میں سے ہر ایک یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں اور اس کے جیون ساتھی میں کوئی فرق نہیں۔ گویا وہ "یک جان دو قالب" ہو جاتے ہیں۔ پھر بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان خود اپنے آپ پر اعتماد نہ کرے یا اپنے آپ سے خیر خواہی نہ کرے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان خود اپنے آپ کو دھوکا دے 'یا اپنا نقصان کرنے کی کوشش کرے؟

۴۔ **عام انسانی آداب کالحاظ**: مثلاً معاملات میں نرمی' خندہ پیشانی سے ملنا' ایک دوسرے کا احترام کرنا اور اس کے جائز مقام کا اعتراف کرنا۔ یہی وہ "اچھا رہن سہن" ہے جس کا حکم اس آیت کریمہ میں دیا گیا ہے:

﴿ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (النّساء : ۱۹)

"عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے سے رہن سہن رکھو۔"

اور رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے کہ:

((وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا)) [۲۳]

"عورتوں کے ساتھ بھلائی کی نصیحت قبول کرو"۔ [۲۴]

یہ چند آداب ایسے ہیں جن کا تعلق مرد اور عورت دونوں سے ہے اور جن کا دونوں کو خیال رکھنا ضروری ہے۔ قرآنِ مجید میں جس "پختہ وعدہ" کا ذکر کیا گیا ہے اس پر عمل کے لیے ان آداب پر عمل کرنا لازمی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿ وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ○ ﴾ (النّساء : ۲۱)

"اور تم کس طرح ان کو دی ہوئی چیز واپس لے سکتے ہو حالانکہ تم ایک دوسرے کے پاس جا چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں؟"

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل ہو سکتی ہے:

﴿ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ ﴾

(البقرۃ : ۲۳۷)

"اور آپس کے معاملات میں فیاضی کو فراموش مت کرو۔ اللہ یقیناً تمہارے عملوں کو دیکھ رہا ہے۔"

میاں بیوی کے الگ الگ حقوق اور آداب جن کا انہیں خیال رکھنا ضروری ہے' ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

خاوند کے ذمہ بیوی کے حقوق

خاوند کو اپنی بیوی کے متعلق مندرجہ ذیل آداب کالحاظ رکھنا چاہیئے۔

(۱) اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا' کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ ﴾ (النّساء : ۱۹)

"اور تم عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے سے رہن سہن رکھو"۔

جب خاوند کھانا کھائے تو عورت کو بھی کھلائے' خود کپڑا پہنے تو اسے بھی پہنائے۔ اگر اس کی طرف سے سرکشی کے آثار محسوس ہوں تو اُسے اس انداز سے تنبیہہ کرے جس طرح اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے' یعنی پہلے اسے سمجھائے اور نصیحت کرے لیکن گالی گلوچ نہ کرے۔ اگر عورت کی اصلاح ہو جائے تو بہتر ورنہ اس سے بستر میں علیحدگی اختیار کرلے۔ اگر عورت اس کی اطاعت کرنے لگے تو بہتر ہے ورنہ اسے ہلکا سا مارے' لیکن چہرے پر نہ مارے۔ اتنا نہ مارے کہ خون بہنے لگے' یا کسی عضو کی شکل بگڑ جائے' یا کوئی عضو اپنا کام انجام دینے کے قابل نہ رہے۔ اس کی دلیل قرآنِ مجید کی یہ آیت کریمہ ہے:

﴿ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۗ ﴾

(النّساء : ۳۴)

"پس اگر تمہیں ان سے سرکشی کا خطرہ ہو تو انہیں نصیحت کرو' اور ان سے بستروں میں جدائی اختیار کرو اور انہیں پیٹو۔ پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو پھر ان پر (زیادتی کی) راہ تلاش نہ کرو۔"

ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: "ہم پر بیویوں کا کیا حق ہے؟" تو آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((اَنْ تُطْعِمَهَا اِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوْهَا اِذَا اكْتَسَيْتَ' وَلاَ تَضْرِبِ الْوَجْهَ' وَلاَ تُقَبِّحْ' وَلاَ تَهْجُرْ اِلاَّ فِي الْبَيْتِ)) (۲۵)

"یہ حق ہے کہ جب تو کھانا کھائے تو اسے بھی کھلائے' اور جب تو کپڑا پہنے تو اسے بھی پہنائے' اور اسے چہرے پر نہ مارنا' اسے برا بھلا نہ کہنا' اس سے جدائی اختیار نہ کرنا مگر گھر ہی میں"۔

نیز فرمایا:

((اَلاَ وَحَقُّهُنَّ عَلَيْكُمْ اَنْ تُحْسِنُوْا اِلَيْهِنَّ فِيْ كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ)) (۲۶)

"سنو! تم پر ان کا یہ حق ہے کہ ان کے لباس اور کھانے (کے معاملے) میں ان سے حسن سلوک کرو"۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

((لاَ يَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً - اَيْ لاَ يُبْغِضْهَا - اِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ)) (۲۷)

"کوئی مؤمن مرد مؤمن عورت سے بغض نہ رکھے' اگر اس کی ایک عادت بری لگے تو دوسری اچھی بھی لگے گی"۔

(۲) اگر عورت دین کے مسائل سے واقف نہیں تو مرد کو چاہیئے کہ اسے ضروری مسائل کی تعلیم دے' یا اسے علم کی مجلسوں میں حاضر ہونے کی اجازت دے تاکہ وہ دین سمجھ سکے۔ کیونکہ عورت کو جتنی ضرورت کھانے پینے کی ہے جس کا مہیا کرنا مرد کا فرض ہے' اس سے زیادہ ضرورت اس کے دین کی اصلاح اور روح کی صفائی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْآ اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ..... ﴾

(التحریم: ۶)

"اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچالو۔"

اور گھر والوں میں عورت شامل ہے۔ اور وہ آگ سے تبھی بچ سکتی ہے اگر اس کا ایمان صحیح اور عمل نیک ہوں۔ اور نیک اعمال کی ادائیگی کے لیے اور انہیں شریعت کے مطابق انجام دینے کے لیے علم ضروری ہے۔ اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے بھی فرمایا:

((اَلَا وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا' فَاِنَّمَا هُنَّ عَوَانٍ - اَسِيْرَاتٌ - عِنْدَكُمْ))(۲۸)

"خبردار! عورتوں کے بارے میں میری بھلائی کرنے کی وصیت قبول کرو' وہ تو تمہارے پاس (گویا) قیدی ہوتی ہیں"۔

عورت کے متعلق نبی ﷺ کی وصیت اسی طرح قبول کی جاسکتی ہے کہ اسے وہ علم سکھایا جائے جس سے وہ اپنے دین کی اصلاح کرلے' اور اسے ایسا ادب سکھایا جائے جس سے وہ راہِ راست پر قائم رہ سکے۔

(۳) اسے اسلام کے احکام اور آداب پر عمل کرنے کا حکم دے اور اس کی کوتاہی پر مواخذہ کرے۔ مثلاً بے پردگی سے اور نامحرم مَردوں سے میل جول سے منع کرے' اس کا مناسب طریقے سے خیال رکھے' اسے اخلاق یا دین کی کسی خرابی میں مبتلا نہ ہونے دے' اسے ایسا موقع نہ دے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی مخالفت کرکے فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے' کیونکہ مَرد اس کا نگہبان ہے' وہ اس کے متعلق جواب دہ ہے' اور اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کا ذمہ دار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ... ﴾ (النّساء : ۳۴)

"مَرد عورتوں کے نگران اور سرپرست ہیں۔"

اور جنابِ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِيْ اَهْلِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ))(۲۹)

"مَرد اپنے گھر والوں کا نگران ہے' اور اس سے اپنی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا"۔

(۴) اگر ایک شخص کی ایک سے زیادہ بیویاں ہیں تو اس کا فرض ہے کہ ان کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھے۔ کھانے پینے میں' لباس میں' رہائش میں اور رات گزارنے میں اُن سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔ ان میں کسی معاملہ میں جانب داری اختیار نہ کرے(۳۰) نہ ظلم و زیادتی سے کام لے' کیونکہ یہ حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلاَّ تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾

(النّساء : ۳)

"اگر تمہیں خطرہ ہو کہ تم انصاف نہیں کر سکو گے تو ایک عورت (سے نکاح کرو)' یا جو تمہارے ہاتھوں کی ملکیت ہیں (یعنی لونڈی پر اکتفا کرو)۔"

اور جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عورتوں سے حسن سلوک کی ہدایت فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ' وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ)) (۳۱)

"تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو' اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سے بہتر ہوں"۔

⑤ اس کا راز فاش نہ کرے' اگر اس میں کوئی عیب (۳۲) ہے تو اس کا ذکر نہ کرے' کیونکہ عورت اُس کے پاس ایک امانت ہے اور اس کا خیال رکھنا اور اس کا دفاع کرنا اس کا فرض ہے۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّ مِنْ اَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ الرَّجُلَ يُفْضِيْ اِلٰى امْرَاَتِهٖ وَتُفْضِيْ اِلَيْهِ ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا)) (۳۳)

"قیامت کے دن اللہ کے ہاں بد ترین مقام کا حامل وہ مرد ہو گا جو اپنی عورت کے پاس جاتا ہے اور وہ اس کے پاس جاتی ہے' پھر وہ اس کا راز فاش کر دیتا ہے"۔

بیوی کے ذمہ خاوند کے حقوق

بیوی کو خاوند کے درج ذیل حقوق و آداب کا خیال رکھنا چاہیئے:

① خاوند کے حکم کی تعمیل بشرطیکہ وہ کسی ناجائز کام کا حکم نہ دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ﴾ (النّساء : ۳۴)

"پھر اگر وہ عورتیں تمہاری اطاعت کریں تو ان پر زیادتی کا راستہ تلاش نہ کرو۔"

جنابِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَاَتَهٗ اِلٰی فِرَاشِهٖ فَلَمْ تَاْتِهٖ فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَیْهَا لَعَنَتْهَا الْمَلٰئِکَةُ حَتّٰی تُصْبِحَ)) (۳۴)

"اگر مرد اپنی عورت کو بستر پر بلائے اور وہ نہ آئے اور مرد رات کو ناراض رہے تو فرشتے اس عورت پر صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں"۔

آنحضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے:

((لَوْ کُنْتُ آمِرًا اَحَدًا اَنْ یَسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا)) (۳۵)

"اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ کسی کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ مرد کو سجدہ کرے"۔

(۲) خاوند کی عزت اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے' خاوند کے مال اور اولاد کی حفاظت کرے اور گھر کے باقی تمام معاملات کو صحیح طریقے سے انجام دے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ﴾ (النساء: ۳۴)

"پس نیک عورتیں فرماں بردار ہوتی ہیں اور (خاوند کی) غیر موجودگی میں اس چیز کی حفاظت کرتی ہیں جس کی حفاظت کا اللہ نے حکم دیا ہے۔"

جنابِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((وَالْمَرْاَةُ رَاعِیَةٌ عَلٰی بَیْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهٖ)) (۳۶)

"عورت اپنے خاوند کے گھر کی اور اس کی اولاد کی نگران ہے"۔

اور یہ بھی فرمایا:

((فَحَقُّکُمْ عَلَیْهِنَّ اَنْ لَا یُوْطِئْنَ فُرُشَکُمْ مَنْ تَکْرَهُوْنَ' وَلَا یَاْذَنَّ فِیْ بُیُوْتِکُمْ لِمَنْ تَکْرَهُوْنَ)) (۳۷)

"ان کے ذمہ تمہارا یہ حق ہے کہ تمہارے بستر پر اُس شخص کو نہ بیٹھنے دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو' اور تمہارے گھروں میں ان افراد کو آنے کی اجازت نہ دیں جنہیں تم ناپسند کرتے ہو"۔

(۳) اپنے خاوند کے گھر میں رہے۔ بلا اجازت وہاں سے نہ نکلے۔ اپنی نظریں نیچی رکھے اور آواز پست رکھے۔ اپنے ہاتھ کو برائی سے اور زبان کو فحش بکنے اور بے ہودہ گوئی سے بچائے۔ خاوند کے رشتہ داروں سے اسی طرح حسن سلوک کرے جس طرح وہ خود کرتا ہے۔ کیونکہ جو عورت خاوند کے والدین اور عزیز و اقارب سے بد سلوکی کرتی ہے اسے خاوند کے ساتھ حسن سلوک کرنے والی نہیں سمجھا جا سکتا۔

ان آداب کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

ارشادِ خداوندی ہے:

﴿ وَقَرْنَ فِىْ بُيُوْتِكُنَّ وَلاَ تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى ... ﴾

(الاحزاب: ۳۳)

"اور اپنے گھروں میں ٹکی رہو' اور پہلی جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو..."

نیز ارشاد ہے:

﴿ فَلاَ تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِىْ فِىْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ ... ﴾

(الاحزاب: ۳۲)

"پس ایسے نرم انداز سے بات نہ کرو کہ دل میں (گندے خیالات کی) بیماری رکھنے والا (مرد) کوئی طمع کرنے لگے..."

نیز ارشاد ہے:

﴿ لاَ يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ ... ﴾ (النساء: ۱۴۸)

"اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے کہ بلند آواز سے بری باتیں کہی جائیں..."

ایک مقام پر فرمایا:

﴿ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلاَ يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلاَّ مَا ظَهَرَ مِنْهَا ... ﴾ (النور: ۳۱)

"مومن خواتین سے فرما دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں' اور اپنی زینت ظاہر نہ کریں مگر جو (خود ہی) ظاہر ہو جائے..."

جناب رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

((خَيْرُ النِّسَآءِ الَّتِيْ اِذَا نَظَرْتَ اِلَيْهَا سَرَّتْكَ' وَاِذَا اَمَرْتَهَا اَطَاعَتْكَ' وَاِذَا غِبْتَ عَلَيْهَا حَفِظَتْكَ فِيْ نَفْسِهَا وَمَالِكَ)) (۳۸)

"بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اسے دیکھے تو تجھے خوشی ہو' جب تو اسے حکم دے تو وہ تیری اطاعت کرے اور جب تو اس کے پاس سے غیر حاضر ہو تو اپنی جان اور تیرے مال کے بارے میں تیرا خیال رکھے"۔

ارشادِ نبوی ہے:

((لَا تَمْنَعُوْا اِمَاءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ (۳۹) ' وَاِذَا اسْتَاْذَنَتِ امْرَاَةُ اَحَدِكُمْ اِلَى الْمَسْجِدِ فَلَا يَمْنَعُهَا)) (۴۰)

"اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے مت روکو۔ اور جب تم میں سے کسی کی عورت مسجد میں جانے کی اجازت مانگے تو وہ اسے منع نہ کرے"۔

نیز فرمایا:

((اِئْذَنُوْا لِلنِّسَاءِ بِاللَّيْلِ اِلَى الْمَسَاجِدِ)) (۴۱)

"رات کے وقت عورتوں کو مسجدوں میں جانے کی اجازت دے دیا کرو"۔

حواشی

(۲۰) اسے سنن اربعہ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے "صحیح" قرار دیا ہے۔ دیکھئے جامع الترمذی' کتاب الرضاع' باب ماجاء فی حق المراۃ علی زوجھا۔

(۲۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب رحمتہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الصبیان والعیال وتواضعہ وفضل ذلك

(۲۲) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیہ المسلم مایحب لنفسہ من الخیر۔

(۲۳) صحیح مسلم' کتاب الرضاع' باب الوصیۃ بالنساء وصحیح البخاری' کتاب الانبیاء' باب خلق آدم وذریتہ

(۲۴) یعنی میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ عورتوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ۔ میری اس نصیحت پر عمل کرو۔

(۲۵) ابوداؤد' كتاب النكاح' باب في حق المراة على زوجها۔ اس کی سند حسن ہے۔

(۲۶) سنن الترمذی' كتاب الرضاع' باب ما جاء في حق المراة على زوجها وسنن ابن ماجه' كتاب النكاح' باب حق المراة على الزوج

(۲۷) صحيح مسلم' كتاب الرضاع' باب الوصية بالنساء۔

(۲۸) صحيح البخاری' كتاب الانبياء' باب خلق آدم وذريته۔ وصحيح مسلم' كتاب الرضاع' باب الوصية بالنساء۔ یہ الفاظ جامع ترمذی میں ہیں۔ دیکھئے كتاب الرضاع' باب ما جاء في حق المراة على زوجها۔

(۲۹) صحيح البخاری' كتاب الاحكام' باب الاستقراض' كتاب الوصايا' باب تاويل قوله تعالى : ﴿ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَا اَوْ دَيْنٍ ﴾ ۔ وصحيح مسلم' كتاب الامارة' باب فضيلة الامير العادل وعقوبة الجائر والحث على الرفق بالرعية

(۳۰) ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل و انصاف اور مساوات قائم نہ رکھنے پر حدیث نبویؐ میں شدید وعید وارد ہوئی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ كَانَتْ لَهُ امْرَاَتَانِ فَلَمْ يَعْدِلْ بَيْنَهُمَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَشِقُّهُ سَاقِطٌ)) (سنن الترمذی' كتاب النكاح' باب ما جاء في التسوية بين الضرائر) "جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل نہ کرے تو وہ قیامت کے روز اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو فالج زدہ ہو گا"۔

الفاظ کے اختلاف کے ساتھ یہ حدیث سنن ابی داؤد اور سنن النسائی میں بھی وارد ہوئی ہے۔

(۳۱) ابن ماجه' كتاب النكاح' باب حسن معاشرة النساء۔ سنن دارمی' كتاب النكاح' باب في حسن معاشرة النساء۔ اس کی سند حسن ہے۔

(۳۲) یعنی ایسا جسمانی عیب جو عام طور پر لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے۔

(۳۳) صحيح مسلم' كتاب النكاح' باب تحريم افشاء سر المراة

(۳۴) صحيح البخاری' كتاب النكاح' باب اذا باتت المراة مهاجرة فراش زوجها۔ وصحيح مسلم' كتاب النكاح' باب تحريم امتناعها من فراش زوجها۔

(۳۵) ابوداؤد' كتاب النكاح' باب في حق الزوج على المراة (الفاظ کے معمولی فرق سے) جامع الترمذی' كتاب الرضاع' باب ما جاء في حق الزوج على المراة۔ امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔

(۳۶) صحيح البخاری' كتاب الاحكام' باب قول الله تعالى : ﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾ ۔ وصحيح مسلم' كتاب الامارة' باب فضيلة

الامیر العادل وعقوبۃ الجائر

(۳۷) جامع الترمذی' کتاب الرضاع' باب ما جاء فی حق المراۃ علی زوجھا۔ ابن ماجہ' کتاب النکاح' باب حق المراۃ علی الزوج

(۳۸) طبرانی' اس کی سند صحیح ہے۔

(۳۹) صحیح البخاری' کتاب الجمعۃ' باب ھل علی من لا یشھد الجمعۃ غسل من النساء والصبیان ونحوھم۔ وصحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب خروج النساء الی المساجد اذا لم یترتب علیہ فتنۃ (صرف پہلا فقرہ)

(۴۰) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب استئذان المراۃ زوجھا فی الخروج الی المسجد وغیرہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب خروج النساء الی المساجد اذا لم یترتب علیہ فتنۃ

(۴۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعۃ' باب ھل علی من لا یشھد الجمعۃ غسل من النساء والصبیان وغیرہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب خروج النساء الی المساجد۔

بقیہ: ذکر کثیر سے کیا مراد ہے؟

السِّلْمِ کَافَّۃً'' کا تقاضا ہے۔ اور اگر راقم ٹھوکر نہیں کھا رہا (اللہ اس سے بچائے' آمین!) تو یہی مروجہ سلاسلِ تصوف اور طریقت کا حاصل اور لب لباب ہے۔

اگرچہ عملی طور پر جو کچھ محسوس ہوتا ہے اور نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ان سلاسل سے منسلک افراد کی اکثریت اجتماعی زندگی کے بہت سے معاملات اور جہاد و قتال کے ساتھ نفاذ شریعت مطہرہ اور قیامِ حدود کو نہ داخل ذکر سمجھتی ہے نہ اس کے لئے جدوجہد کو ضروری۔ اور مزید برآں اس کمی اور کوتاہی کو دوام ذکر کے مرتبے کے حصول کا کوئی عیب اور رخنہ بھی نہیں گردانتی۔

الی اللہ اشتکی الذی ذکرہ علی الالسنۃ الکثیرۃ من المسلمین

اور

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات!

ولیمے کا وجوب اور جامع ترمذی کی ایک روایت

حافظ نذیر احمد ہاشمی صاحب کی تحقیق

حدیث کے الفاظ ((اولم ولو بشاة)) سے اہل ظاہر استدلال کرتے ہیں کہ ولیمہ واجب ہے۔ چنانچہ ابنِ حزم المحلی میں لکھتے ہیں:

وفرض علی کل من تزوج ان یولم بما قل او کثر

(المحلی' ج۹' ص ٤٥٠)

جبکہ جمہور علماء کے نزدیک ولیمہ سنت اور مستحب ہے۔ جمہور کی دلیل معجم اوسط (طبرانی) میں مروی ابو ہریرہؓ کی روایت ہے:

"الولیمة حق" (ای لیست بباطل بل یندب الیها وهی سنة ولیس **المراد بالحق الوجوب**) (فتح الباری' ج۹' ص ٢٣٠)

بعض شافعیہ کے نزدیک بھی ولیمہ واجب ہے۔ علامہ نووی لکھتے ہیں: **واما ولیمة العرس فقد اختلف اصحابنا فمنهم من قال هی واجبة ...... ومنهم من قال : هی مستحبة** . (المجموع 'شرح مهذب ج١٥' ص ٥٤٨)

علامہ قرطبی نے مالکیہ کا مذہب غیر مشہور وجوب اور مذہبِ مشہور استحباب بیان کیا ہے۔ امام احمد کا مسلک المغنی لابن قدامہ میں ولیمہ کے سنیت و استحباب کا ہے۔ احناف کے نزدیک ولیمہ کی حیثیت استحبابِ مؤکد کی ہے۔

ولیمہ کے وقت کے حوالے سے ترمذی کی ایک روایت:

عن ابن مسعود قال : قال رسول الله صلی الله علیه وسلم : ((طعام اول یوم حق (ای لیس بباطل) **وطعام یوم الثانی سنة وطعام یوم الثالث سمعة))**

''حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''پہلے دن کا کھانا (ولیمہ) حق اور دوسرے دن کا کھانا سنت ہے' جبکہ تیسرے دن کا کھانا ریاکاری ہے''۔

اگر چہ اس حدیث سے اس امر کی جانب بھی رہنمائی ملتی ہے کہ پہلے دن یعنی نکاح کے دن بھی ولیمہ کیا جا سکتا ہے لیکن جمہور علماء اس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ ولیمہ دو دن تک جائز ہے' اس سے زیادہ مکروہ ہے۔ مالکیہ کے نزدیک ولیمہ سات دن تک مستحب ہے۔ ان کا استدلال مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت ہے:

حدثنا ابو هشام عن حفصة قالت لما تزوج ابی سیرین دعا اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم سبعة ایام فلما کان یوم الانصار دعاهم ودعا اُبی بن کعب وزید بن ثابت (مصنف ج۲'ص ۳۱۳)

یہ اور اس طرح کی دیگر روایات سے مالکیہ ولیمہ کے سات دن تک استحباب پر استدلال کرتے ہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ روایات اس صورت پر محمول ہیں جبکہ ہر روز کے مدعوین جدا جدا ہوں۔ چنانچہ ابن حجر لکھتے ہیں:

انما تکره اذا کان المدعو فی الثالث هو المدعو فی الاول

(فتح الباری ج۹' ص ۲۴۳)

یعنی اگر فخر و مباہات مقصود نہ ہو' نیز مدعوین ہر دن کے جدا جدا ہوں تو سات دن تک ولیمہ کے جواز کے جمہور علماء بھی قائل ہیں۔ چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانی نے ''اعلاء السنن'' میں باب باندھا ہے: **باب جواز الولیمة الی ایام ان لم یکن فخرًا**

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ترمذی کی مذکورہ بالا ضعیف روایت میں ولیمہ کے آغاز کے بارے میں نہیں بلکہ اس کی انتہائی مدت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ یعنی اگر کوئی ولیمہ پہلے دن یا عند العقد یا قبل الدخول یا بعد الدخول نہ کر سکے تو کب تک اس استحباب یا سنیت سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

یہود ونصاریٰ کے آلۂ کار دانشوروں کے ہاتھوں فکرِ اسلامی کو مسخ کرنے کی سازش

تحریر: خالد محمود عباسی

قرآن حکیم قصّہ آدم و ابلیس کے ذریعے اس طرف راہنمائی کرتا ہے کہ کائنات میں معرکہ خیر و شر ازل سے جاری ہے اور تا قیامِ قیامت جاری رہے گا۔ اس معرکے کے لئے ابلیس اپنے اسلحہ خانے کے نت نئے ہتھیار آزمانے کے ساتھ ساتھ آزمودہ قدیم ہتھیاروں کی صلاحیت میں بھی اضافہ کرتا رہتا ہے، جن میں سے ایک انتہائی آزمودہ، قدیم اور تباہ کن ہتھیار حق و باطل کا التباس ہے، جس کے ذریعے وہ حق و باطل کا امتیاز مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ باطنی بصیرت رکھنے والے اس کی فریب کاری پر متنبہ رہتے ہیں لیکن عام لوگ بالعموم اس کے مکر و فریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انڈیا کے ایک معروف سکالر جناب اسرار عالم نے شیطان کے اس طریقہ کار کی وضاحت اپنی کتاب ''دجال'' میں یوں کی ہے:

> ''ابلیس کی ایک Methodology کو سمجھنا ضروری ہے جس کا استعمال تاریخِ انسانی میں اس نے کئی بار کیا ہے اور آج بھی الگ الگ طریقوں سے کر رہا ہے۔ اس طریقہ کار کا نام ہے نقلی و جعلی تعین کا طریقہ (Dummy Identification Methodology)۔۔۔۔ حق اور مظہرِ حق مثلاً کسی نبی اور آج کسی تحریک حق یا قائدِ حق کے اعلانِ حق کے ساتھ ہی ابلیس ایک طریقہ یہ بھی اپناتا ہے کہ جہاں اس فرد، فکر یا تحریک کو جھٹلانے اور اسے مبنی بر غلط ثابت کرنے کی کوشش ہوتی ہے وہاں اس کی بھی کوشش ہوتی ہے کہ اس وقت اسی طرح کے الفاظ و بیان یا نعروں یا نصب العین کے ساتھ کئی اور لوگ یا افراد کے ذریعے تحریکیں شروع کر دی جاتی ہیں، جو بیشتر جعلی اور اہلِ ھویٰ کے ذریعے

چلائی جاتی ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد لوگوں کو کنفیوژ کرنا اور نفس مسئلہ کو الجھا دینا اور اہل حق یا فردِ حق کی انفرادیت کو مجروح' گدلا اور دھندلا کر دینا ہوتا ہے''۔

شیطان کا یہ طریقہ کار اتنا کار آمد اور تباہ کن ہے کہ اولادِ آدم کی اکثریت کو اس نے اسی طریقہ کار کے ذریعے سواء السّبیل سے بھٹکا دیا یا بھٹکا دینے کی کوشش کی۔ حق و باطل میں التباس پیدا کرنے اور ان کا فرق مٹانے کے لئے انسانوں ہی کے افراد استعمال کئے جاتے ہیں جو اکثر و بیشتر اپنی خاص افتادِ طبع' ذہنی رجحان یا بقول ایک معروف کالم نگار ''خبطِ عظمت'' کے باعث لاشعوری طور پر آلۂ کار بن جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں بھارت اور پاکستان میں بھی ایسے دانشوروں کا ایک گروہ موجود ہے جو جماعت اسلامی میں کچھ عرصہ فعّال اور سرگرم رہنے اور اسلامی انقلابی فکر کے پُر جوش مبلغ اور پرچارک رہنے کے بعد یا تو جماعت سے از خود علیٰحدہ ہو گئے یا اس سے ''خارج'' کر دیئے گئے تو وہ اس فکر کو ہی مسخ اور مجروح کرنے کے کام میں لگ گئے اور اسلامی انقلاب کی جدّوجُہد کو ''کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا'' کے مترادف سمجھتے ہوئے اپنے ذہن وفکر کی جملہ صلاحیتوں کو اس سے گریز اور فرار کی راہیں تلاش کرنے ہی میں صرف کرنے کو مقصدِ حیات بنائے بیٹھے ہیں۔ چنانچہ اب ان دانشوروں کی کل سعی و جُہد اس ایک نقطے پر مرکوز ہے کہ کسی طرح حقیقی اسلامی فکر اور دعوتِ حق کو نہ صرف اعلانیہ جھٹلایا جائے اور اسے مبنی بر غلط ثابت کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ اپنے مخصوص مقاصد کی بجا آوری کے لئے نہ صرف حدیث وسنّت کی حجیت کو لطیف ہتھکنڈوں کے ذریعے کمزور اور ڈھیلا کیا جائے بلکہ قرآن حکیم کی آیاتِ بیّنات کی بھی ایسی ایسی توجیہات اور من پسند تاویلات کی جائیں جو سلف صالحین سے لے کر آج تک راسخون فی العلم کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آئی ہوں۔ قرآن کی معنوی تحریف اور استخفافِ سنّت کا یہ کھیل دانشورانہ موشگافیوں کی آڑ میں اس دلیری اور ڈھٹائی سے کھیلا جاتا ہے کہ عقل و دانش بھی حیرت سے دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کوشش کا اصل مقصد قرآن کی انقلابی فکر کو مجروح' گدلا اور دھندلا کر دینا اور اس کے ذریعے عوام النّاس کو

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورۃ مائدہ آیت ۵۱ کا ترجمہ عام طور پر صحیح نہیں کیا جاتا۔ اس لئے اس سے غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل قرآن مجید ایک نہایت مربوط کلام ہے۔ یہ علیٰحدہ علیٰحدہ اقوال کا مجموعہ نہیں ہے۔ اس لئے قرآن کی ہر آیت سے کوئی معنیٰ اخذ کرتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کس سیاق وسباق میں بات کہی جا رہی ہے۔ عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جس نکرہ لفظ کے ساتھ ''ال'' آ جائے وہ اسم نکرہ سے اسم معرفہ ہو جاتا ہے۔ پھر یہ لفظ عام معنی سے ہٹ کر خاص معنی دیتا ہے۔

سورۂ مائدہ کے اس مقام پر ان یہودیوں اور عیسائیوں کے متعلق تجزیہ ہو رہا ہے جن کو حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زبانی بہت واضح طریقہ سے اسلام کا پیغام پہنچا دیا گیا۔ اس کے باوجود انہوں نے نہ صرف یہ کہ ماننے سے انکار کر دیا بلکہ مسلمانوں کے خلاف مستقل طور پر سازشوں کا جال بُننا شروع کیا۔ چنانچہ ان مخصوص لوگوں کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ اس طرح کے یہودی اور عیسائیوں سے مسلمان دوستی کا تعلق نہ رکھیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ دوستی کی آڑ میں مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں گے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

''اے ایمان والو! ان یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ یہ باہم دوست ہیں ایک دوسرے کے۔ تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے گا تو وہ انہی میں سے ہے۔ بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' (مائدہ ۵' آیت ۵۱)

اس آیت سے عمومی معنی کسی طرح بھی نہیں نکالے جا سکتے۔ اس لئے کہ تاریخ کے کئی ادوار میں یہودی اور عیسائی ایک دوسرے کے دوست تو کجا' خون کے پیاسے رہے ہیں۔ اور پھر چند ہی آیات بعد قرآن مجید مزید تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ عیسائی دوستی میں مسلمانوں سے قریب تر ہیں۔ اس آیت میں قرآن نے ''ال'' کا لفظ استعمال نہ کر کے اس بات کو عمومی بنا دیا ہے۔

''تم مسلمانوں سے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ یعنی عیسائی ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور بالکل نہیں ہے۔'' (مائدہ ۵' آیت ۸۲)

اگر آیت ۵۱ کو عمومی بنا دیا جائے تو پھر آیت ۸۲ کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔
بلکہ دونوں ایک دوسرے سے متضاد معنیٰ دینے لگتے ہیں۔
اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ آیت ۵۱ نبی ﷺ کے زمانے کے صرف ان یہودیوں وعیسائیوں سے متعلق ہے جن کی حضورؐ اور مسلمانوں سے دشمنی وعناد بالکل ظاہر ہو چکا تھا اور وہ ہر وقت مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ اس کا کوئی تعلق عام یہود و نصاریٰ سے نہیں ہے''۔

فاضل مضمون نگار نے عربیت کے نشتر سے قرآن کو آپریٹ کر کے جو عمارت کھڑی کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ آیت ۵۱ خاص یہود اور نصاریٰ سے متعلق ہے اور آیت ۸۲ عام نصاریٰ سے بحث کرتی ہے۔ اس کے لئے بنیاد ''الف لام'' (ال) کو بنایا گیا ہے جو کسی نکرہ اسم کو معرفہ کرتا ہے۔ یعنی کسی اسم کو عام معنی سے خاص معنی کا حامل بنا دیتا ہے۔ تاہم دیگر زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی کسی اسم کے خاص کرنے کا یہی واحد طریقہ نہیں ہے بلکہ کچھ دوسری وجوہات بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً اسم علم بھی معرفہ ہوتا ہے' اسم موصول اور معرفہ کی طرف مضاف ہونے والا اسم بھی معرفہ ہوتا ہے' ضمائر بھی معرفہ ہوتی ہیں۔ البتہ ''ال'' ایک سے زائد اقسام کا ہوتا ہے۔ یہ موصولہ بھی ہوتا ہے' معہودِ ذہنی کے لئے بھی آتا ہے اور ''ال'' جنس کا بھی ہوتا ہے جو کسی لفظ پر آ کر اس کی پوری جنس کا احاطہ کرتا ہے۔ آیت ۵۱ میں الفاظ ''یہود'' اور ''نصاریٰ'' پر ''ال'' جنس کا ہے اور اس سے مراد تمام یہود اور نصاریٰ ہیں' جن سے وہ یہود اور نصاریٰ مستثنیٰ ہیں جن کا قرآن نے بالترتیب سورۂ آل عمران آیت ۱۱۳ میں اور سورۂ مائدہ آیت ۸۲ میں ذکر کیا ہے۔ جبکہ فاضل مضمون نگار نے اپنے مخصوص طریقہ کار کے تحت ''ال'' کو محض عہد ہی کا ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے' جس پر تاکید کا رنگ چڑھاتے ہوئے وہ یہاں تک لکھ بیٹھے کہ ''اس آیت سے عمومی معنی کسی طرح بھی نہیں نکالے جاسکتے''۔ اسی طرح انہوں نے آیت ۸۲ سے مراد عام نصاریٰ لینے کی کوشش کی ہے اور یہ مغالطہ آمیز شوشہ چھوڑا ہے کہ ''اگر آیت ۵۱ کو عمومی بنا دیا جائے تو پھر آیت ۸۲ کے کوئی معنی ہی نہیں

رہتے بلکہ دونوں ایک دوسرے سے متضاد معنیٰ دینے لگتے ہیں''۔ یہاں فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آیت ۸۲ کو عمومی بنا دیا جائے تو سورہ مائدہ ہی کی آیت ۱۴ ﴿وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ﴾ ''اور ہم نے پختہ عہد لیا ان لوگوں سے جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں تو وہ بھول گئے ایک حصّہ جس کے ذریعے وہ نصیحت کیے گئے تھے۔'' کے کیا معنیٰ متعین کیے جائیں گے؟ کیونکہ یہاں بھی لفظ نصاریٰ نکرہ ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ المائدۃ آیت ۸۲ میں مذکور نصاریٰ عام نصاریٰ نہیں ہیں بلکہ خاص ہیں۔ ایک اس وجہ سے کہ ''قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى'' ''اَلَّذِيْنَ'' کا صلہ ہے اور دوسرا اس وجہ سے کہ ''اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً'' کی علت متصل آیات ۸۳تا۸۶ میں بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ جو نصاریٰ اس علّت کا معلول نہیں ہوں گے وہ آیت ۸۲ کے حکم سے خارج ہو جائیں گے۔ جن آیات میں یہ علّت بیان کی گئی ہے ان کا ترجمہ یہ ہے:

> ''یہ اس وجہ سے ہے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور وہ غرور بالکل نہیں کرتے۔ اور جب انہوں نے سنا جو رسول کی طرف نازل کیا گیا تو آپ نے ان کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بہتا ہوا دیکھا بسبب جو انہوں نے حق سے پہچانا۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے ربّ! ہم ایمان لائے، ہمیں گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں ایمان نہ لائیں اللہ پر اور اس پر جو ہمارے پاس حق میں سے آیا جبکہ ہم طمع رکھتے ہیں کہ ہمارا ربّ ہمیں نیکوکار لوگوں میں داخل فرمائے۔ ان کے ایسا کہنے پر اللہ نے بدلے میں انہیں ایسے باغات ہمیشہ کے لئے عطا کئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور ایسا ہی نیکوکاروں کا بدلہ ہے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ جہنمی ہیں۔''

اب کون شریف النفس ہوگا جو موجودہ عیسائیت کو ان صفات سے مُتّصف مانے جن کا ذکر آیات ۸۳تا۸۶ میں کیا گیا ہے؟ کہاں وہ جن میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر ہیں اور کہاں یہ جو اپنے خالق و مالک سے بے خبر لذّاتِ دُنیوی اور

شہواتِ حیوانی میں مگن ہیں۔ کہاں وہ تواضع وانکسار کے پیکر اور کہاں یہ موسیقی، شراب اور لغویات کے دلدادہ اور رسیا۔ اور کہاں وہ کہ جو طالب آخرت اور اپنے ربّ کی رضا کے جویا ہیں اور کہاں یہ کہ جو دنیا ہی کو جنّت سمجھ کر اسی کے ہو گئے۔ ہر دو کے درمیان آخر کون سی قدر مشترک ہے سوائے نام کے؟ اور یہ بھی درحقیقت ایک مغالطہ ہی ہے کیونکہ یہ اپنا نام ''نصاریٰ'' تج کر ''مسیحی'' ہونے کے دعوے دار ہیں۔ یہاں یہ بھی جان لینا چاہئے کہ حضور ﷺ کے دَور کے اکثر نصاریٰ بھی اسی نام کو اختیار کر چکے تھے سوائے ان کے کہ جن کا ذکر سورۂ مائدہ آیت ۸۲ میں کیا گیا ہے۔ جو حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد رشید شمعون صفا کے پیرو تھے۔ ان ہی میں سے ایک حضرت نجاشیؓ بھی تھے۔ یہ لوگ حضور ﷺ کی دعوت پر ایمان لے آئے تھے، جبکہ ان کے برعکس مسیحیت کے علم بردار نصاریٰ نے حضور ﷺ کی دعوت کو نہ صرف ردّ کر دیا تھا بلکہ آپؐ کی مخالفت میں بھی سرگرم رہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے تدبر قرآن میں اس حقیقت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

> ''یہاں قرائن دلیل ہیں کہ اس سے مراد یہ عام مسیحی نہیں ہیں جو پال کی ایجاد کردہ مسیحیت کے پیرو، تثلیث و کفارہ وغیرہ کے قائل اور اسلام دشمنی میں تمام اعدائے اسلام کے سرخیل ہیں، بلکہ اس سے مراد سیدنا مسیحؑ کے خلیفہ راشد شمعون صفا کے پیرو ہیں جو پال کی تمام بدعات سے بالکل الگ حضرت مسیحؑ کی اصل تعلیم پر قائم رہے اور جن کے باقیاتِ صالحات آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد آپؐ کی دعوت پر اسلام لائے۔ نجاشی وغیرہ اسی باایمان گروہ سے تعلق رکھنے والے تھے۔ یہاں جو قرائن ہمارے اس نظریئے کی تائید میں ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔
>
> ایک یہ کہ ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ﴿اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰی﴾ (جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقہ کو اُس وقت تک نہ صرف یہ کہ اپنے اس نام کی اہمیت و معنویت کا احساس تھا بلکہ ان کو اس پر فخر بھی تھا۔ یہ فرقہ، جیسا کہ نصاریٰ کی تاریخ سے ثابت ہے، صرف شمعون صفا کے پیروؤں کا

تھا' پال کے ماننے والوں کی نسبت ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کر آئے ہیں کہ وہ اپنے کو نصاریٰ کہلانا حقیر سمجھتے تھے' چنانچہ انہوں نے اس کو بدل کر مسیحی نام اختیار کر لیا تھا۔ ولیم بلیکی اپنی بائبل ہسٹری میں لکھتا ہے:

''بارنباس اور پال انطاکیہ میں ایک سال تک غیر خدا پرستوں کو نصرانی بنانے میں مصروف رہے۔ معلوم ہوتا ہے اسی سال (۴۴ء میں) پہلی بار نصرانیت اختیار کرنے والوں کو مسیحی (Christian) کا نیا اور شاندار نام دیا گیا۔''
(بائبل ہسٹری۔ ولیم بلیکی' ص ۳۹۷)

اس عبارت میں ''مسیحی کا نیا اور شاندار نام'' کے الفاظ نگاہ میں رہیں۔ اس سے صاف واضح ہے کہ پال اور اس کے پیرو ''نصاریٰ'' کے لفظ کو اپنے لئے حقیر خیال کرتے تھے اور موجودہ مسیحیت تمام تر اسی پال کی ایجاد ہے۔

دوسرا یہ کہ اس گروہ کی صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ ان میں علماء اور زاہد ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ صفت موجودہ عیسائیوں پر صادق نہیں آتی۔ علماء اور زہاد کے الفاظ یہاں نہایت اچھے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ موجودہ کلیسائی نظام کے پروہتوں کے لئے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہیں۔ پھر ان کے باب میں فرمایا ہے کہ ''وہ تکبر نہیں کرتے''۔ مجھے بار بار خیال ہوتا ہے کہ یہ سیدنا مسیحؑ کی اس بات کی طرف اشارہ ہے جو انجیلوں میں ہے کہ ''مبارک ہیں وے جو دل کے غریب ہیں' آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے۔'' موجودہ مسیحی جن کی رعونت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے اصلی نام کو بھی حقیر سمجھتے ہیں اور اس کی جگہ انہوں نے اپنے لئے ایک نیا نام پسند کیا ہے' وہ اس صفت کے مصداق کس طرح قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

تیسرا یہ کہ اس گروہ کے متعلق آگے کی آیات میں صاف تصریح ہے کہ یہ سب لوگ آنحضرت ﷺ پر دلی جوش و خروش کے ساتھ ایمان لائے اور قرآن کا انہوں نے اس طرح والہانہ خیر مقدم کیا گویا وہ مدتوں سے اس کے لئے سراپا شوق و انتظار تھے''۔

چونکہ اسلامی انقلابی فکر کے یہ منحرفین (deserters) فکرِ فراہی سے وابستہ

ہونے اور مولانا امین احسن اصلاحی کے تنہا وارث ہونے کے دعوے دار ہیں اس لئے درج بالا اقتباس اس حقیقت پر سے بھی پردہ اٹھا دیتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف اپنے دعوے پر پورے نہیں اترتے بلکہ فکرِ فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی پر قبضہ غاصبانہ جمائے بیٹھے ہیں۔ جہاں اس حقیقت سے پردہ اٹھا ہے وہاں جملہ معترضہ کے طور پر ایک دانشورانہ کرتب کا نظارہ کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ آیت ۵۱ میں **الیہود** "ال" کے ساتھ ہے اور آیت ۸۲ میں بھی اس کی یہی پوزیشن ہے جبکہ آیت ۵۱ میں النصاریٰ "ال" کے ساتھ ہے اور آیت ۸۲ میں بغیر "ال" کے ہے۔ فاضل مضمون نگار نے دانشورانہ مہارت سے نصاریٰ کو عام ثابت کرنے کی کوشش کی جسے اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ان کا دعویٰ نصاریٰ کے حق میں جائز قرار پائے گا، لیکن دیکھئے وہ یہود کا بھی ہاتھ پکڑے ساتھ لئے جا رہے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں "اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ آیت ۵۱ نبی ﷺ کے زمانے کے صرف ان یہودیوں اور عیسائیوں سے متعلق ہے جن کی حضور ﷺ اور مسلمانوں سے دشمنی و عناد بالکل ظاہر ہو چکا تھا اور وہ ہر وقت مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتے تھے، اس کا کوئی تعلق عام یہود و نصاریٰ سے نہیں ہے۔" گھٹنا مار کر آنکھ پھوڑنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔

علاوہ ازیں تدبرِ قرآن کے درج بالا اقتباس سے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی ہے کہ آیت ۸۲ میں جن نصاریٰ کا ذکر ہے ان کی کوئی دور کی نسبت بھی آج کے نصاریٰ سے تو کیا خود حضور ﷺ کے دَور کے نصاریٰ سے بھی نہ تھی۔

حضور ﷺ کے دَور کے عام عیسائیوں کی حقیقت جاننا اور موجودہ عیسائیت کو پہچاننا بھی ازبس ضروری ہے، کیونکہ یہی چیز سورۂ مائدہ کی آیت ۵۱ میں پوشیدہ حکمتِ قرآنی کے عظیم خزانے کی شاہ کلید (Master Key) ہے۔

حضور ﷺ کے دَور کی عیسائیت کیوں پال ازم ہے؟ کا جواب **ایک عیسائی مائیکل ایچ ہارٹ** نے درج ذیل الفاظ میں بیان کیا:

"Christian theology however was shaped principally

by the work of St. Paul. Jesus presented a spiritual message: Paul added to that the worship of Christ. Furthermore, St. Paul was the author of a considerable portion of the New Testament, and was the main proselytizing force for Christianity during the first century.

------ At the time of Jesus' death, his followers simply formed a small Jewish sect. It was due in considerable measure to Paul's writings, and to his tireless proselytizing efforts, that this small sect was transformed into a dynamic and much greater movement, which reached non-Jews as well as Jews, and which eventually grew in to one of the great religions of the world.

For these reasons, some people even contend that it is Paul, rather than Jesus, who should really be considered the founder of Christianity. (The 100, pp. 47-48)

''عیسائیت کی مذہبی تعلیمات اصولاً تو سینٹ پال کی کتاب کی بنیاد پر ترتیب دی گئیں جنہیں روحانی پیغام کے طور پر پیش کیا گیا۔ پال نے اس میں مسیح کی عبادت کا اضافہ کیا۔ سینٹ پال عہد نامہ جدید کے ایک بڑے حصے کا مصنف تھا۔ اور پہلی صدی عیسوی کے دوران عیسائیت کی اشاعت کی اصل قوت تھی۔

مسیح کی وفات کے وقت اس کے پیروکاروں نے ایک چھوٹا سا یہودی فرقہ تشکیل دیا۔ یہ پال کی تحریروں کی اہمیت اور اس کی انتھک ارتدادانہ کوششوں کی وجہ سے تھا کہ یہ چھوٹا سا فرقہ ایک جاندار اور بہت بڑی تحریک کی شکل اختیار کر گیا جس نے غیر یہودیوں بلکہ یہودیوں تک رسائی حاصل کر لی اور جو بالآخر ترقی کرتے کرتے دنیا کے عظیم ترین مذاہب میں شمار ہونے لگا۔

یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ مسیح کی بجائے سینٹ پال کو عیسائیت کا بانی تصور کرتے ہیں''۔

اس وجہ سے پال ازم (مسیحیت) اور نصرانیت میں فرق کیا جاتا ہے۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۵۱ میں ''النصاریٰ'' سے مراد پال ازم کے پیروکار اور آیت ۸۲ کے ''نصاریٰ'' سے مراد سیدنا مسیحؑ کے سچے پیروکار ہیں۔ پال ازم کو سمجھنے کے لئے ذرا پال

کی اصلیت بھی مائیکل ایچ ہارٹ کے الفاظ ہی میں جان لیجئے۔

The apostle Paul, who was a younger contemporary of Jesus, became the foremost proselytizer of the new religion of Christianity. His influence on Christian theology proved to be the most permanent and far-reaching of all Christian writers and thinkers. Paul also known as Saul, was born in Tarsus, a city in Cilicia (in present day Turkey), a few years into the Christian era. Although a Roman citizen, he was of Jewish birth, and in his youth he learned Hebrew and received a thorough Jewish education. He also learned the trade of tentmaking. As a young man, he went to Jerusalem to study under Rabbi Gamaliel, an eminent Jewish teacher. Though Paul was in Jerusalem at the same time as Jesus, it is doubtful whether the two men ever met." (The 100;p.61)

''پال پیغامبر جو کہ مسیح کا نوجوان ہم عصر تھا وہ عیسائیت کے نئے مذہب کا سب سے بڑا پرچارک بن گیا۔عیسائیت کی مذہبی تعلیمات پر اس کا اثر عیسائیت کے دوسرے مصنفین اور مفکرین سے زیادہ' انتہائی مستقل اور مؤثر ثابت ہوا۔
پال جس کو سال بھی کہتے ہیں' وہ سلیشیا کے ایک شہر ٹرسس میں (جو کہ آج کل ترکی میں ہے) سن عیسوی کے ابتدائی سالوں میں پیدا ہوا۔ اگر چہ وہ رومن شہری تھا لیکن نسلی طور پر وہ یہودی تھا اور نوعمری میں اس نے عبرانی بھی سیکھ لی اور مکمل یہودیت کی تعلیم بھی حاصل کر لی۔اس نے خیمہ سازی کا کام بھی سیکھ لیا۔ جوان ہو کر وہ یروشلم گیا تا کہ ایک مشہور یہودی استاد ربانی گیملیل سے علم حاصل کرے۔ اگر چہ مسیح کے عہد میں ہی پال یروشلم میں موجود تھا مگر یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی کہ دونوں کی آپس میں کبھی ملاقات بھی ہوئی ہو''۔

چنانچہ پال خود ایک یہودی تھا جس نے سازش کر کے حضرت مسیحؑ کی اصل تعلیمات کو مسخ کر دیا اور عیسائیت کی روح کو یہودی بدن میں دفنا دیا۔ نتیجتاً یہ بھی یہودیوں ہی کی طرح حق اور اہل حق کے دشمن بن گئے۔اسی حقیقت کا اظہار مولانا اصلاحی نے یوں کیا ہے:
''یہاں قرائن دلیل ہیں کہ اس سے مراد یہ عام مسیحی نہیں ہیں جو پال کی ایجاد

کردہ مسیحیت کے پیرو' تثلیث اور کفّارہ وغیرہ کے قائل اور اسلام دشمنی میں تمام اعدائے اسلام کے سرخیل ہیں۔''

یہ ہے عیسائیت کا اڑنے سے پہلے ہی گرفتار ہونے کا حادثہ۔ لیکن اس نقلی اور جعلی (Dummy) عیسائیت نے خونخواری اور حق دشمنی کی طرف بڑی زقند تب لگائی جب ۳۰۰ء میں پوری سلطنت روما نے عیسائیت کو قبول کر لیا۔ اب اس میں پال ازم کے ساتھ ہی ساتھ رومن اور یونانی تصورات نے بھی راہ پالی۔ اس حقیقت کو ایک اور عیسائی برٹرینڈ رسل کے الفاظ میں دیکھئے:

> *The Christians, retaining the Judaic belief in a special revelation, added to it the Roman desire for worldwide domanion and the Greek taste for metaphysical sublities. The combination produced the most fiercely persecuting religion that the world has yet known."* (*In Praise of Idleness, p. 108*)
>
> ''عیسائیوں نے یہودیوں کے خصوصی الہامات کو مانتے ہوئے اس پر رومیوں کی عالمگیر مملکت اور مابعد الطبیعیاتی توہمات کا اضافہ کیا۔ اس مرکب کے نتیجہ میں ایک انتہائی پُرتشدد مذہب وجود میں آیا کہ اس طرح کا کوئی مذہب اُس وقت تک موجود نہ تھا۔''

پال ازم کے فساد اوّل کے بعد یہ وہ فساد ثانی ہے جو عیسائیت کے اندر پیدا ہوا' جس کے تحت انہوں نے ایک طرف یونانیوں کے توہمات کو اپنے اندر جمع کر لیا تو دوسری طرف رومیوں کی پوری دنیا پر غالب آنے کی تمنا بھی عیسائیت کے اندر منتقل ہو گئی۔ اس جلتی پر تیل کا کام مسخ شدہ مذہبی تعلیمات نے کیا اور عیسائیت نے ایک خونخوار مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ یہ تھی وہ عیسائیت جو حضور ﷺ کے دَور میں بالعموم پائی جاتی تھی' جن میں خال خال وہ بھی مل جاتے تھے جن کا ذکر آیت ۸۲ میں آیا ہے۔ اسی وجہ سے مولانا اصلاحی نے انہیں ''اعدائے اسلام کے سرخیل'' قرار دیا ہے۔

درج بالا دو فسادوں کے بعد عیسائیت کے اندر تیسرے بہت ہی بڑے فساد کا آغاز ستر ہویں صدی سے یہود کے ذریعے ہوا' جس نے عیسائیت کو مکمل طور پر یہودیت

آلۂ کار بنا دیا۔ اس حقیقت کو جناب اسرار عالم نے اپنی کتاب ''دجّال'' میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''عیسائیت میں یہودی سازش کے نتیجے میں رونما ہونے والی تفریق کی سب سے بڑی پیداوار پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں جو رومن کیتھولک سے الگ ہو کر اب خود سینکڑوں فرقوں میں بٹ چکے ہیں۔ یہ تفریق دراصل یہودیوں کی کاشتہ اور پرداختہ تھی۔ اس لئے یہودیت سے قربت اور ان کے عمیل کی حیثیت سے کارگزاری ان میں سے ہر فرقے کا خاصہ اور مقصد وجود ہے۔ ہر چند کہ ان کا ظاہری تشخص عیسائیت کا ہے لیکن یہ عیسائی سے زیادہ یہودی ہیں اور زیادہ بہتر طور پر کہا جائے تو یہودی عیسائی یا عیسائی یہودی ہیں۔''

عیسائیت کیسے یہود کی ہمنوا بنی؟ اس حقیقت سے عرب کے معروف سکالر ڈاکٹر سِفرالحوالی یوں پردہ اٹھاتے ہیں:

''ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ عیسائی مسلمانوں کے ساتھ ہوتے' کیونکہ عیسائی عقیدے کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو سولی چڑھانے والے یہودی ہیں' البتہ ہمارا عقیدہ تو واضح ہے ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ مگر عیسائی تو عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کے نبی کو قتل کرنے والے اور حواریوں کو اذیت میں مبتلا کرنے والے یہودی ہیں اور اوّلین عیسائیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے والے بھی یہی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف یہودی عیسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا اور فریبی سمجھتے ہیں اور نزولِ مسیح کے بھی قائل نہیں۔ یہودیوں کے خلاف عیسائیوں کا مسلمانوں کی طرف جھکاؤ یقیناً معقول رویّہ ہوتا' مگر یہودیوں نے اپنے مکروفریب' چالاکی اور دھوکہ بازی سے عیسائیوں کی ناسمجھی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں اپنا ہم نوا بنالیا ہے اور یہ موقع یوں کہہ کر نکال لیا کہ ہم دونوں یہود و نصاریٰ ایک ہی کتاب کے پیروکار ہیں' یعنی ''کتابِ مقدّس''۔

آپ جانتے ہیں کہ کتابِ مقدس دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ عہد قدیم (Old Testament) جو دراصل تورات ہے اور عہد نامہ جدید (New Testament)—— مذکورہ بالا موضوعات اپنی طوالت کے ساتھ عہد نامہ قدیم میں آتے ہیں' جس کا فائدہ یہ ہوا کہ کتاب مقدس پڑھنے والا اپنی ابتداء تورات

سے کرتا ہے اور سب سے پہلے مذکورہ بالا موضوعات اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ مبتدی کے ذہن میں واضح ہو جاتے ہیں' جس کے نتیجے میں اس کا وہی عقیدہ بنتا ہے جو یہودیوں کا اپنا عقیدہ ہے۔ عیسائیوں کی مسلمانوں سے نہ ملنے کی ایک وجہ تو یہ ہے' اور دوسری وجہ قرآن مجید میں آتی ہے اور وہ اہل کتاب کا مسلمانوں سے حسد ہے جو اُن کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے''۔

فاضل مصنّف موجودہ صورتِ حال کی عکاسی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اب ہم اپنی گفتگو کا رخ عیسائیوں پر مرکوز کرتے ہیں' کیونکہ فی زمانہ ہم ان کے کہنے پر چل رہے ہیں' خواہ انہوں نے ہمیں ہر بار دھوکہ ہی کیوں نہ دیا۔ عیسائیوں کا ایک عقیدہ جان لیجئے! جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھائے گئے تو اس زمانے کے عیسائیوں نے دعویٰ کیا کہ عنقریب ایک سال بعد نزولِ مسیح ہوگا' پھر وہ دنیا پر ایک ہزار سال حکمرانی کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ سن ایک ہزار عیسوی کے اختتام پر دنیا کے بیشتر عیسائی نزولِ مسیح کے منتظر رہے۔ اب پھر عیسوی جنتری کے حساب سے دو ہزار سال مکمل ہونے والے ہیں اور مذکورہ بالا عقیدہ پھر سے منظر عام پر آ گیا ہے جس کی رو سے نزولِ مسیح مملکت اسرائیل یعنی فلسطین میں ہوگا جو ان کا آبائی وطن ہے اور یہودیوں کا فلسطین میں آباد ہونا نزولِ مسیح کا پیش خیمہ ہے۔ اس عقیدے کو عہد ہزار سالہ (Millenarian) کہتے ہیں۔ اس لئے چار دہائیاں پہلے عیسائیوں نے ارض فلسطین میں یہودی آباد کاری کی بنیاد رکھی نزول مسیح کی تمہید کے طور پر۔ یہودیوں سے پہلے عیسائیوں نے اسرائیل کی بنیاد ڈالی۔ یہ عقیدہ عیسائیوں کے بنیادی عقائد میں سے ہے جس پر وہ پختہ ایمان رکھتے ہیں''۔

''......عہد ہزار سالہ کا عیسائی عقیدہ امریکی سربراہان کے پیش نظر رہا ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کتاب ''البعد الدّینی'' کا مؤلف لکھتا ہے کہ صدر جمی کارٹر نے اپنے اس عقیدے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات کی نوعیت صرف خاص ہی نہیں بلکہ یہ اپنی نوعیت کے منفرد تعلقات ہیں جن کی جڑیں ہمارے دلوں میں' ہمارے اخلاقیات میں اور عوام کے اعتقادات میں ہیں۔ دونوں ممالک کے قیام میں

اوائل مہاجرین کا ہاتھ ہے اور یہ انعام تورات کی پیشین گوئی کے مصداق ہے۔
کتاب کا مؤلف مزید لکھتا ہے کہ سات امریکی سابقہ سربراہان معرکہ ہرمجدون پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ عرب یہود تنازعہ کی نوعیت وہی ہے جو داؤدؑ اور جالوت جسے وہ گولتھ (Goliath) کہتے ہیں' کے مابین تھی۔ جالوت سے عرب مراد ہیں اور داؤدؑ سے یہودی۔ معاذ اللہ"۔

"...... پروٹسٹنٹ تحریک کے اثر سے ہی عیسائی اس بات کے قائل ہوئے کہ فلسطین یہودیوں کی سرزمین ہے اور اس وقت سے عیسائی یہودی باہمی تعلقات سدھرنے لگے۔ یہودیوں کی طرح پروٹسٹنٹ فرقے نے بھی امریکہ کی طرف ہجرت کی' کیونکہ اس فرقہ کے حامی کیتھولک فرقے کے ستائے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اپنی اس ہجرت کو بنی اسرائیل کی ہجرت سے تشبیہ دی اور کہا کہ جیسے بنی اسرائیل ارض مقدس میں وارد ہوئے تھے ویسے ہی ہم امریکہ میں وارد ہوئے ہیں۔ انہوں نے شہروں کے نام انہی ناموں پر رکھے جن کا ذکر تورات میں آیا۔ یہ امریکی اپنے آپ کو تورات کی تعلیمات پر مانتے ہیں اور سرزمینِ امریکہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت مانتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض امریکی بنیاد پرست فلسطین کی بجائے امریکہ کو ارضِ موعود سمجھتے ہیں"۔

"...... یہ الفاظ کانگریس میں خارجہ کمیٹی کے چیئرمین کے ہیں اور یہ بات ۱۹۲۲ء کی ہے۔ یعنی اسرائیل بننے سے ۲۶ سال پہلے۔ وہ بار بار اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "مجھے ہرگز گوارا نہیں کہ قدس پر محمّدیوں کی حکومت ہو"۔
آپ کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اس آگ کو بھڑکانے والے یہودیوں سے پہلے عیسائی تھے۔ فلسطین میں قیامِ اسرائیل کی ضرورت پر عیسائی پہلے ایمان لائے تھے' جبکہ یہودی بعد میں"۔ (ماہنامہ میثاق' جولائی ۲۰۰۰ء)

اس موضوع پر ایک مشہور امریکی مصنّفہ Grace Halsell کی کتاب "Forcing God's Hand" چشم کشا حقائق پر مبنی ہے۔ یہاں اس کتاب پر ایک امریکی سکالر کا مختصر تبصرہ پیش خدمت ہے:

"In Forcing God's Hand ______activating their quick Rapture and Armageddon______Christian zealots are demanding immediate destruction of

Jerusalem's most holy Islamic Shrine. Halsell exposes this most preposterous "Christian" doctrine______ that a Third Temple must be built in Jerusalem, that animal sacrifices be resumed, and that Jesus Christ preside on a Jewish throne ______ to carry out Old Testament rituals." (Andrew T. Killgore)

''کتاب "Forcing God's Hand" کی رو سے جنونی عیسائی نجات (Rapture) اور آخری جنگِ عظیم (Armageddon) کو تحریک دے کر مقدس اسلامی عبادت گاہ (مسجدِ اقصیٰ) کو مسمار کئے جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ہال سیل نے اس نہایت احمقانہ ''مسیحی'' کلئے کا پول کھول دیا ہے کہ یروشلم میں ایک تیسرا کلیسا ضرور تعمیر ہونا چاہئے اور جانوروں کی قربانی کی تجدید ہونی چاہئے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ ایک یہودی تخت پر براجمان ہوں گے اور پرانے صحیفے میں درج رسوم کو جاری کریں گے''۔

یہودیوں نے جس طرح عیسائیوں پر نفوذ کیا ہے اور نتیجتاً ''خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا شوقِ نخچیری'' کے مصداق اب عیسائی یہودی مشن کو اپنا مشن سمجھ رہے ہیں اور اسرار عالم کے الفاظ میں ''یہ عیسائی سے زیادہ یہودی ہیں اور زیادہ بہتر طور پر کہا جائے تو ''یہودی عیسائی'' یا ''عیسائی یہودی ہیں''۔ اس کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اگر یہودیوں نے اس خوبی سے عیسائیوں کو رام کر کے اپنے کام پر لگا رکھا ہے اور ان کی تکمیل اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے تو کیا یہ ناممکن ہے کہ خود مسلمانوں پر بھی اس انداز سے انہوں نے کام کیا ہو؟

اس اعتبار سے تاریخ اسلام کا جائزہ لیں تو چونکا دینے والے حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح یہود نے پال کے ذریعے عیسائیت پر نقب اوّل لگائی بالکل اسی طرح اسلام میں نقب لگانے کے لئے عبداللہ بن سبا جو کہ پال ہی کی طرح یہودی تھا اور اسی کی طرح اسلام لے آیا تھا' نے پال ہی کی طرح سازش تیار کی۔ لیکن چونکہ اُمّتِ مُسلمہ آخری اُمّت ہے' قرآن آخری کتاب ہے اور اس اُمت کے ایک

گروہ کے ہمیشہ حق پر قائم رہنے کی بشارت نبی اکرم ﷺ نے دی ہے' اس لئے اس کی سازش جزوی طور پر ہی کامیاب ہو سکی۔ لیکن جو اُس کی سازش کا شکار ہوئے اُن کے بارے میں یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ خیر و شر کے آخری معرکے میں وہ دجّال کے ساتھی ہوں گے۔ اس لئے کہ مسلم شریف کی روایت کے مطابق ''جب دجّال نکلے گا تو اصفہان کے ستر ہزار یہودی اُس کے ساتھ ہوں گے''۔ مزید برآں یہی سازش خلافتِ راشدہ کے خاتمے کا باعث بنی۔ دوسرا یہ کہ جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو جیسے رومن ایمپائر کے عیسائیت اختیار کرنے کے بعد عیسائیت میں دوسری خرابی پیدا ہوئی اسی طرح دورِ ملوکیت میں دینِ اسلام میں تفریق پیدا کر دی گئی۔ چنانچہ ایک طرف اُمورِ دنیا اور اُمورِ دینیہ کی تقسیم وجود میں آئی تو دوسری طرف پوپ اور بادشاہ کی طرح ملّا و صوفی اور خلیفہ کی تقسیم وجود میں آ گئی۔

تیسرا اور اہم تر نکتہ یہ کہ جیسے یہودیوں نے پروٹسٹنٹس کو یہ پٹی پڑھائی تھی کہ اپنے اور خدا کے درمیان سے کلیسا اور پادری کو نکال دو' تمہارے لئے اللہ کی کتاب (توراۃ) کافی ہے' پھر اس کتاب کی من پسند تاویلات کر کے عیسائیوں کو گمراہ کیا' مقامِ حیرت ہے کہ اس واردات کو تقریباً انہی الفاظ میں مسلمانوں کے ہاں دہرایا گیا اور یہاں بھی نعرہ لگا کہ ''حسبنا کتاب اللّٰہ'' کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ ظاہر ہے سُنّتِ رسول کے بغیر کتاب کو موم کی ناک بنانا کیا مشکل ہے؟ چنانچہ اُمّت کے اندر اس نوعیت کا پہلا فتنہ برپا کرنے والا غلام احمد قادیانی تھا جس نے اُمت کے ذہین عنصر کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ جو بچ رہے انہیں غلام احمد پرویز نے شکار کر لیا۔ اور یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں کا ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ مذکورہ بالا شخصیات کی تعلیمات کے زیرِ اثر ہے۔ چنانچہ ان خاندانی غلاموں کے زیرِ اثر دہلی کے مولانا وحید الدّین خان اور پاکستان میں انہی کے فکر کو فروغ دینے والا ایک گروپ مل کر ایک نئے ہتھکنڈے کے ذریعے رہی سہی اسلامی فکر کی بنیادیں کھودنے کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کوئی عربیت کے گھوڑے پر سوار ہو کر من پسند تاویلات میں لگا

ہے تو کوئی محبت و مودّت کے گیت الاپتے ہوئے ''صلح حدیبیہ'' کا ڈھول پیٹ رہا ہے اور کوئی حکمت و دانش کے نام پر امن و آشتی اور صلح و صفائی کی سوغات بانٹنے میں مصروف ہے۔ مدعا سب کا ایک ہے: جہاد و قتال سے توبہ' اسلامی روایات سے پسپائی' آزادیٔ نسواں اور دین اسلام کو سیکولرائز کر کے محض پوجا پاٹ کا مذہب بنا دینا۔ اس طرح جہاں فکر اسلامی کو مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہاں فری میسنری کے ذریعے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ ساتھ حکومتی اداروں' عدلیہ' ہر سطح کی بیوروکریسی اور یہاں تک کہ تعلیم میں بھی سرنگ لگا دی گئی ہے۔ چنانچہ جس طرح عیسائی یہودی مشن میں لگے ہوئے ہیں اور اب دنیا میں ''عیسائی صہیونی'' (Christian Zionists) کے عنوان سے جانے جاتے ہیں اسی طرح بہت سے مسلمان دانشور اور حکمران بھی اُن کے شانہ بشانہ خدمت ابلیس میں جتے ہوئے ہیں' لٰہذا بجا طور پر "Muslim Zionists" کہلانے کے مستحق ہیں۔

بہر حال یہود و نصاریٰ کے گٹھ جوڑ کا چار سو سالہ عمل اب اپنے نقطۂ عروج کو چھو رہا ہے۔ چنانچہ اسی کے نتیجے میں امریکی صدر کے اپنے الفاظ میں ''مقدس صلیبی جنگ'' (Crusade) شروع کی جا چکی ہے اور درج بالا سازش کے زیر اثر پوری مسلم دنیا کے مسلمان حکمران یہود و نصاریٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی و جُہد میں لگے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش میں جبراً ''جوتے اتروا کر جانے'' کو بھی توہین نہیں سمجھتے اور میزبان ہونے کی صورت میں ان کے جوتے چاٹنے کو بھی سعادت سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے نام نہاد مذہبی دانشور اسلام کی ایسی تصویر کی نوک پلک سنوارنے میں لگے ہیں جو اِن حکمرانوں کے دل کو لبھائے اور تمغۂ قبولیت اور تمغۂ حسنِ کارکردگی کے طور پر طلسماتی پردے پر پھریرے لیتے ہوئے ''حبِّ شہرت'' کی تسکین کا سامان ہوتا رہے۔ اس پس منظر کو سورۂ مائدہ کی آیات ۵۱ اور ۵۲ بھرپور انداز میں رنگ بھر کر نکھار دیتی ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ

بَعْضٍ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۝﴾ (آیت ۵۱)

''اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ' وہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے گا وہ انہی میں شمار ہوگا۔ بے شک اللہ ایسی ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''

دیکھئے آیت ۵۲ درج بالا کیفیت کا کیسے نقشہ کھینچ کر رکھ دیتی ہے:

﴿فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْهِمْ یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَاۤ اَسَرُّوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ۝﴾

''تو تم دیکھو گے کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیماری (نفاق) ہے وہ یہ کہتے ہوئے ان کی طرف (ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے) بڑھتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ کوئی مصیبت ہمیں نہ آ لگے' تو بعید نہیں کہ اللہ تمہیں فیصلہ کن فتح دے دے یا اس کے پاس سے کوئی حکم (عذاب) آ جائے تو یہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ارادوں کے باعث شرمسار ہو جائیں''۔

درج بالا ترجمہ پڑھنے کے بعد ہر قاری کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ فاضل مضمون نگار ان آیات کو کیوں حضور ﷺ کے دَور کے لئے خاص کرنا چاہتے ہیں۔ اصلاً یہ آیات ان تمام لوگوں کا پول کھول دیتی ہیں جو اپنے مصائب کے حل' مشکلات کے ازالے اور بلاؤں سے پناہ طلب کرنے کے لئے جوتے اتروا کر امریکی گود میں پناہ لینے کے لئے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اگرچہ فاضل مضمون نگار کا کہنا ہے کہ ''تاریخ کے کئی ادوار میں یہودی اور عیسائی ایک دوسرے کے دوست تو کجا خون کے پیاسے رہے ہیں'' لیکن آیت ۵۱ کو خاص مان کر اصلاً مراد یہ لی گئی ہے کہ وہ صرف حضور ﷺ کے دَور میں دوست رہے ہیں۔ یہ تاریخی حقائق کا منہ چڑانے والی بات ہے۔ یہود و نصاریٰ تاریخ انسانی میں پہلی بار عصر حاضر میں باہم دوست بنے ہیں۔ چنانچہ قرآن کہ جس میں حضور ﷺ کے فرمان کی رو

سے ''تمہارے بعد کے حالات کی خبریں بھی موجود ہیں'' اس نے ان آیات میں آج ہی کے دَور کے لئے پیشین گوئی کی تھی۔ اس لئے ان آیات کا حرف حرف آج کے حالات پر صادق آتا ہے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ کی باہم دوستی تو ہے ہی۔ جو مسلمان یہود کی سازش میں اُن کے لئے آلہ ٔ کار بنیں گے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اُن ہی میں شمار کئے جائیں گے۔ گویا یہی لوگ درحقیقت Muslim Zionists کہلانے کے مستحق ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جو سورۂ مائدہ آیت ۱۴ کے آخری حصہ اور آیت ۵۱ کے تقابلی مطالعہ سے سامنے آتی ہے۔ وہاں فرمایا: ﴿فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ ''ہم نے ان کے درمیان بغض اور عداوت قیامت تک کے لئے ڈال دی۔'' اب چونکہ آیت ۵۱ کے عین مطابق دوستی ہو چکی ہے لہٰذا یہ درحقیقت قیامت کی علامات میں سے ایک علامت ہے اور یہی وہ حکمت قرآنی کا خزانہ ہے۔ لیکن اس خزانے کا نقشہ احادیث میں موجود ہے اور بغیر نقشے کے خزانے کو حاصل کرنا ناممکن ہے۔ انہی علامات قیامت میں سے ایک اور بڑی علامت جس سے تمام انبیاءؑ نے پناہ طلب کی اور اپنی اپنی اُمتوں کو خبردار کیا وہ فتنہ المسیح الدجال ہے۔ اگرچہ قرآن میں یاجوج ماجوج کا تذکرہ موجود ہے لیکن فتنہ المسیح الدجال کا ذکر اشارتاً بھی نہیں ہے۔ چنانچہ علماءِ محققین کے لئے یہ سوال ہمیشہ حل طلب رہا کہ اتنے اہم فتنے کا ذکر قرآن میں کیوں نہیں ہے۔ اس کے بہت سے جوابات دیئے گئے۔ ان میں سے ایک جواب اس امید پر نقل کیا جا رہا ہے کہ جو ابھی کہیں دُور نہیں نکل گئے بلکہ راستے کے نزدیک ہی کہیں پریشان ہیں شاید ان کی آنکھیں کھل جائیں۔

> ''ہماری رائے یہ ہے کہ قرآن حکیم نے دجال کا ذکر اس فتنے کی وجہ سے نہیں کیا۔ وہ آخری زمانے کا بہت بڑا فتنہ ہوگا۔ اس کا ذکر قرآن میں اس لئے ترک کیا گیا ہے تاکہ اللہ ایسے بہت سے لوگوں کو گمراہی میں رہنے دے جو اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث کو جھٹلاتے ہیں، ان کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں یا رسولِ خدا ﷺ کی طرف ان کی نسبت میں عیب نکالتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں

جو فرماوی فرقہ کی مانند اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتے ہیں اور ان کے علاوہ اور بھی عقلیت پسند (منکرینِ الہام) عقلانی (Rationalist) مکتب فکر سے منسوب ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو شرعی نصوص کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اگر تو وہ ان کی نفسانی خواہشات سے ہم آہنگ ہوں تو قبول کر لیتے ہیں وگرنہ رد کر دیتے ہیں اور ان کو جھٹلا دیتے ہیں خواہ ان کی صحت تواتر سے کیوں نہ ثابت ہو چکی ہو۔ وہ محض اپنی خواہشات' جہالت اور لوگوں کی نظروں میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے حدیثوں کو رد کر دیتے ہیں۔ یہ سب لوگ اس قابل ہیں کہ وہ دجّال کے فتنہ میں مبتلا ہوں' اس کے جال میں پھنس جائیں اور اس کی طرح گمراہ ہو جائیں' کیونکہ دجّال کا ذکر ان کو قرآن میں لکھا ہوا نہیں ملا بلکہ سنّت نبویؐ سے ثابت ہے اور سنّت کو وہ مانتے ہی نہیں۔ ہاں اس سنّت کو مانتے ہیں جو ان کی مریض خواہشات کے مطابق ہو' جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے: ''دیکھو ہو سکتا ہے کہ میری حدیث کسی آدمی کے پاس اس وقت پہنچے جب وہ اپنے تخت پر ٹیک لگائے بیٹھا ہو' حدیث سن کر وہ کہنے لگے: ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے' جو چیز اس میں حلال ہے اسے ہم حلال سمجھیں گے اور جو چیز اس میں حرام ہے اسے حرام سمجھیں گے۔ دیکھو! جس چیز کو اللہ کا رسول حرام قرار دیتا ہے وہ اس چیز کی مانند ہے جس کو اللہ نے حرام قرار دیا۔'' (اُمّتِ مُسلمہ کی عمر' صفحہ ۱۰۱' از امین محمد جمال الدین مصری' ترجمہ پروفیسر خورشید عالم)

فی زمانہ باطل کے ساتھ سازگاری اختیار کرنے کے لئے حق و باطل کا امتیاز مٹانے کی جو کوشش ہو رہی ہے' جس کا کسی قدر تفصیلی ذکر اس مضمون کے شروع میں کیا گیا ہے' اس طرح کی کوششیں حضور ﷺ کے دَور میں بھی کی جاتی رہی ہیں۔ اس کی طرف اشارہ قرآن مجید میں سورۃ الحج کی آیت ۵۲ میں کیا گیا ہے:

﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ ج فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ ط وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ﴿﴾﴾

خاموشی ہے۔ کیا اپنی اسلامی فکر کا دفاع کرنا جماعت اسلامی اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتی یا وہ اتنی کامیابی حاصل کرچکی ہے کہ اب ''چھوٹوں'' کو مُنہ لگانا پسند نہیں کرتی؟

آخر میں علماء حقانی سے بھی دست بستہ گزارش ہے کہ ابھی تک انہوں نے فتنہ انکارِ حدیث اور بالخصوص فتنہ استخفافِ سنّت کے مرتکب نام نہاد دانشوروں کو ڈھیل دیئے رکھی ہے جس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اب اتنے جری ہوچکے ہیں کہ آگے بڑھ کر قرآن کی معنوی تحریف پر بھی اتر آئے ہیں اور من پسند توجیہات اور تاویلات کے ذریعے مبادیاتِ دینی کو مسخ کرنے کے بھی درپے ہیں۔ لہٰذا انبیاء کے وارث ہونے اور کتاب اللہ کے محافظ اور نگہبان ہونے کے ناطے آپ کا فرض بنتا ہے کہ میدان میں آ کر ان کے فکر کے ''بیت العنکبوت'' پر ضرب کاری لگائیں۔ بلاشبہ یہ نام نہاد دانشور اس قابل نہیں کہ آپ ان کے مُنہ لگیں' لیکن سوچیے یہ لوگ عامۃ الناس پر اثرانداز ہورہے ہیں۔ اپنے پیارے نبی ﷺ کے اُمتیوں کی خیرخواہی میں آگے بڑھیے تاکہ ان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کے آگے بند باندھا جاسکے' اس سے پہلے کہ وہ اصلی اور خالص (Original & Pure) دین کے مقابلے میں نقلی اور جعلی (Dummy) دین لوگوں کے قلوب واذہان میں راسخ کرنے کی کوشش میں کامیاب ہوجائیں۔

☆ 1994ء میں امریکہ میں محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** کا بیان کردہ

''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب''

اب دو آڈیو سی ڈیز میں دستیاب ہے۔ تقریباً 80 گھنٹوں پر مشتمل (MP-3)

قیمت فی سی ڈی : 60 روپے

ملنے کا پتہ: **مکتبہ مرکزی انجمن خدام القران لاهور**

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501 فیکس: 5834000

تازیانہ تاریخ

''کاش میں اُس ؐ کے پاس جاسکتا اور اُس ؐ کے پاؤں دھوتا!''

۱۱ر ستمبر کے حادثہ کے بعد پاکستان کے طرزِ عمل پر تاریخ کا ایک سبق

عمرانی تاریخ کا وہ بڑا اندوہناک موڑ تھا جب ۶۲۸ ء میں قیصر روم ہرقل نے پیغمبر آخرالزماں ﷺ کا دعوت نامہ آنکھوں سے لگایا' سر پر رکھا اور آپ ؐ کے سفیر کو سلام و نیاز کے ساتھ واپس کر دیا۔ قیصر روم اس وقت تمام مشرقی یورپ کا مطلق العنان بادشاہ تھا۔ حضور ﷺ کا دعوت نامہ اسے اس وقت ملا جب وہ بیت المقدس کی زیارت کے لئے فلسطین آیا ہوا تھا۔ مراسلہ مبارک پڑھ کر اس نے قریش کے تجارتی قافلہ کے ایک وفد کو دربار میں بلایا اور حضور ﷺ کے بدترین دشمن رئیس اعظم مکہ ابوسفیان سے آپ ؐ کے حالاتِ زندگی اور آپ ؐ کی دعوت کے مقاصد دریافت کئے۔ اس مشہور تاریخی مکالمہ میں قیصر کی شخصیت' ذہانت اور نفسیاتی و علمی تفکر کی گہرائی پر کھلی روشنی پڑتی ہے۔ قیصر نے ابوسفیان کے جوابات پر تبصرہ کیا اور انتہائی تاثر' نیازمندی اور تصدیق کا اظہار کرنے کے بعد کہا: ''اگر یہ باتیں سچ ہیں تو خدا کی قسم میرے پاؤں کے نیچے کی مٹی تک وہ قابض ہو جائے گا۔ کاش میں اس ؐ کے پاس جاسکتا اور اس ؐ کے پاؤں دھوتا!''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قیصر کے پاؤں نہیں تھے جن سے چل کر وہ جاتا اور حضور ﷺ کے پاؤں دھو لیتا۔ آخر قیصر نے اس خانہ ساز حسرت و شوق کا اظہار کیوں کیا؟ تاریخ ہی اس کا جواب دیتی ہے کہ ہوسِ سلطنت اس کے قبول اسلام میں حائل رہی کیونکہ اس کا تمام دربار اور پادری اس کے اس رویہ سے برہم اور ناخوش تھے۔ اس لئے اسلام لانے کی صورت میں اسے تاج و تخت ٹھکرانا پڑتا۔ قیصر یہ جرأت نہ کر سکا اور سفیر کو سلام و نیاز اور تحائف کے ساتھ واپس کر دیا۔ عمرانی تاریخ کا یہ بڑا اندوہناک موڑ تھا۔

اس کے بعد یورپ کے ایک ہزار سالہ گھپ اندھیرے سے کون واقف نہیں جو سولہویں صدی تک انسانی شرف وعظمت کے مکروہ جنازے کی صورت میں برملا سب کے سامنے رہا ہے۔ پھر! کہتے ہیں کہ ۱۶۰۰ء کے بعد تاریکیاں چھٹ گئیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ رنگ ونور کی خیرہ کن چادر نے حقیقی کرب پر ایک پردہ ڈال رکھا ہے جس میں اب کھلے شگاف نظر آ رہے ہیں۔ قیصر کی ہوسِ اقتدار کے نتائج صرف مغربی دنیا ہی کو بھگتنے نہیں پڑے، خود اسلام جس کی دعوت کو قیصر نے ٹھکرایا تھا، اس کی رفتارِ حیات اور اندازِ حیات بھی اس کی زد میں آئے اور مسلمان بھی اس کی قیمت بنے۔ گویا اس ڈیڑھ ہزار سال میں عمرانیات کا ہر تاریک پہلو قیصر کے ''احسان'' کا بالواسطہ یا بلاواسطہ ''ممنون'' ہے۔

قیصر کا وہ تبصرہ اور وہ حسرت جو دعوتِ اسلام کے متعلق ہمارے سامنے ہے اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ہرقل اصولِ عمرانی، اصولِ تاریخ اور اصولِ بقاء کی روشنی میں پا چکا تھا کہ زندگی کا ہر قدم تدریجی طور پر انتشار و بدنظمی سے نظم و ترتیب کی طرف اٹھ رہا ہے۔ جو عنصر اس نظم و ترتیب کے مقصد کی مقاومت کرتا ہے وہ مہلتِ اصلاح کے بعد زندگی سے کاٹ کر الگ کر دیا جاتا ہے۔ زندگی کا مقصد، نظم و ترتیب کے راستے اس وحدت تک پہنچنا ہے جو انسانی و کائناتی کثرتوں میں بادیٔ النظر میں نظر نہیں آتی مگر زندگی اس کے حوصلے کے درپے ہے۔ اس لئے وہ اپنے مقصد کے مدمقابل کسی قدر کو خاطر میں نہیں لاتی خواہ وہ کتنی ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو۔

قیصر کو علم تھا کہ میں حضور ﷺ کی ـــــ جو سرورِ عربؐ نہیں ہیں بلکہ سرورِ کائنات ہیں ـــــ دعوت کو مسترد کر کے دراصل زندگی کی عظیم الشان پیش قدمی کی مقاومت کر رہا ہوں۔ اس لئے اس مقاومت کا نتیجہ بھی اس کے سامنے تھا کہ ''وہؐ میرے پاؤں تلے کی مٹی تک قابض ہو جائے گا''۔ قیصر جانتا تھا کہ اصولِ تاریخ بے لچک اور بے رحم حد تک یہی ہے کہ کاروانِ زندگی کا مخلص رکن بن کر اس کا حق رفاقت ادا کرو ورنہ مرگِ ناگہاں کے لئے تیار رہو۔ قیصر نے حقیقت احوال کا اعتراف کرنے کے باوجود ردائے ظلمت آنکھوں پر ڈال لی اور پورے یورپ کو ایک ہزار سال کے لئے زندگی سے کاٹ

کر الگ پھینک دیا۔ تاریخ نے اس دور کا نام یورپ کا ''دورِ مظلمہ''(Dark Age) رکھا ہے۔

ازل سے انسان مطلق اقدار کو خود ''گھڑنے'' کی کوششوں میں لگا ہوا ہے اور اس دم تک یہ ''صنعت'' جاری ہے۔ اس کے متوازی ہر دور میں رسولوںؑ نے بھی ان غیر متغیر' مستقل اور ابدی اقدار کو اس ذات کے حوالے سے پیش کیا جو خود بھی غیر متغیر' مستقل اور ابدی ہے۔ یہ کام نہ انسان کا تھا' نہ ہے۔ اس لئے ہر دور میں انسان اس میں ناکام رہا' اگرچہ کبھی اس کا اعتراف کیا گیا اور کبھی نہیں۔ انسان کا کام یہ اس لئے نہیں کہ ایک تو اس کی چھوٹی سی عقل میں بہبودِ غیر کا تصور ہی اجنبی ہے اور دوسرے اس کا ضمیر بھی مخصوص روایات و تعلیمات میں ڈھلی ہوئی چیز ہے نہ کہ عالمگیر۔ اس لئے انسان کی تیار شدہ مطلق قدریں تمام نوعِ انسانی کے لئے مشترکہ قدریں نہیں بن سکتیں کہ ان سب پر بخوشی کاربند ہوں اور باہمی ٹکراؤ سے بچ کر محبت' اخوت اور امن کے جھولے جھول سکیں۔ نہ مستقل اور ابدی ہو سکتی ہیں کہ ہر آنے والا دور انہیں قبول کرتا رہے۔ انسان نے جب بھی ان اقدار کی ''صنعت'' اپنے ہاتھ میں لی تو درحقیقت اس قدرتی ارتقاء کی مقاومت کی ہے جس کی رفتار کو تیز کرنے اور مقصد حیات تک جلد از جلد پہنچانے کے لئے سلسلۂ انبیاء خدا کی طرف سے یہ قدریں سپردِ انسان کرتا رہا۔

علم و حکمت کے تابندہ تر دور میں انسان کی اس مقاومت اور اساسی اصول گری کے مضحکہ خیز نمونے اور نتائج اگر دیکھنے ہوں تو تاریخ کے اوراق کھلے ہیں۔ ایک دو پر نظر ڈالئے:

عدل: افلاطون کی ''ریاست'' میں عدل نام ہے طاقتور کے مفاد کا۔

عصمت: عورتوں بچوں کا اشتراک بالکل فطری ہے۔

صرف ان دو ''جواہر پاروں'' میں تضاد بھی ملاحظہ ہو کہ عورتوں اور بچوں میں تو اشتراکیت فطری ہے مگر عدل اشتراکی نہیں' وہ صرف طاقتور کے مفاد کا نام ہے۔ پھر اس صنعت میں خود اعتمادی اور خود فریبی کا یہ عالم ہے کہ افلاطون کے الفاظ میں ''یہ لوگ

(اربابِ فکر) کچھ بنا دیں گے' اسے پھر مٹائیں گے۔ یہی کچھ کرتے رہیں گے حتیٰ کہ انسانی راستوں کو ممکن حد تک خدائی راستوں سے ملا دیں گے''۔ گویا جب افلاطونی راستہ خدائی راستہ سے ملے گا تو عدل ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا سب سے زیادہ طاقتور ـــ عالمی ٹولے یا خدا ـــ کے مفاد کا نام بن چکا ہوگا اور یونانی عورتیں بھی عصمت کے میدان میں ترقی کرتے کرتے تمام دنیا کی عورتیں بن چکی ہوں گی۔ آگے چلئے:

مساوات: ارسطو کی ''سیاست'' میں مملکت کا فریضہ ہے کہ افراد کے لئے بہترین زندگی کے وسائل پیدا کرے اور بہترین زندگی کا مستحق ایک ہی طبقہ ہے یعنی اربابِ فکر و نظر۔ باقی لوگ ان کے وسائل مہیا کرنے کا ذریعہ ہیں۔

تکریم آدم: قدرت کا منشاء کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام غیر یونانی یونانیوں کے غلام رہیں۔ (ارسطو)

قدروں کا یہی تصور روم کو ملا تھا جس پر سولہویں صدی تک کارخانۂ یورپ چلتا رہا' بلکہ کہنا چاہئے کہ کارخانہ قدرت کی مقاومت کرتا رہا اور رفتارِ حیات میں کوہِ گراں بن کر ڈٹا رہا۔

زندگی کی جوئے رواں کے رُکنے سے راستے میں جو متعفن جوہڑ پیدا ہو جاتے ہیں انہیں مذہب کی اصطلاح میں فساد کہتے ہیں۔ فساد ایک گھر میں ہو یا ایک قوم میں یا ایک وسیع و عریض خطۂ ارض میں' منشائے قدرت اور قانون مطلق کا مقابلہ ہے اس لئے کہ اس سے ناکردہ گناہ کی ـــ جو اس فساد کی زد میں آئیں ـــ ترقی اور خود حیاتِ کلی کا ارتقاء دونوں متاثر ہوتے ہیں اور انسان کے لئے اپنے مقصد تخلیق تک پہنچنے کی مسافت طویل نیز پیچیدہ و غمناک بن جاتی ہے۔ افلاطون و ارسطو جیسے مایہ ناز حکماء کو زیب نہیں دیتا تھا کہ انسانی و عمرانی گہرائیوں میں تو پاتال کی مٹی بھی نکال لانے کی کوشش کریں اور وسعت میں کنویں کے مینڈک بن جائیں۔

قیصر (ہرقل) بلاشبہ پورے یورپ میں اور ایک طویل دور میں ایک استثناء ہے' مگر اس استثناء میں بھی تمام تر عامل اس کی روح کی پیاس نہیں۔ ایک دوسرا عامل حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے حضور ﷺ کے ورودِ مبارک کی پیشین گوئی اور خوشخبری یعنی عقیدہ بھی ہے' کیونکہ قیصر نے کہا تھا ''مجھے یہ تو علم تھا کہ آنے والا آئے گا' مگر یہ گمان بھی نہ تھا کہ اس علاقہ سے آئے گا''۔ یہ بھی حکمتِ یونانی ہی کا موروثی اعجاز تھا کہ قیصر حضرت محمد ﷺ کو بھی یورپین دیکھنا چاہتا تھا۔

اگرچہ اس دور میں دردمندوں (مذہب کی طرف واپسی کے خواہش مند افراد) کی چیخ و پکار بھی نظر آتی ہے مگر عملاً زمانہ اپنی غیر فطری روش پر بدستور رواں دواں ہے۔ اطالوی مفکر میزنی جس کے بارے میں غلط طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ لی تھی' کہتا ہے:

> ''جو حکومت قوانینِ خداوندی کی ترویج و تنفیذ کی علمبردار نہیں اس کے کسی حق کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت تو منشائے الٰہی کو مشہور و مروج کرنے کے لئے ہے' اگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تو تمہارا حق نہیں بلکہ فرض ہے کہ اسے بدل ڈالو۔ جو قوم وحدتِ عقائد سے محروم ہو اس میں جمہوریت زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتی ہے کہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت پر غالب رہے۔ غالب انسان ایک (بادشاہ) ہو یا زیادہ (اکثریت)' بات ایک ہی ہے۔ انسانوں سے اوپر اقتدارِ اعلیٰ کی عدم موجودگی کا انجام طاقتور انسان کی بندگی کے سوا کچھ نہیں۔''

پروفیسر الفریڈ کوبن کے نزدیک:

> ''اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ رضائے عامہ کو قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ رضائے عامہ اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔ تاریخ اول سے لے کر آخر تک گواہ ہے کہ اس کا نتیجہ آمریت ہے۔''

اسی طرح آج کا یورپ قبل مسیح کے یونان سے کم نہیں' یہ اسی بے بنیاد اور بے مقصد سطح پر کھڑا ہے جہاں قبل مسیح کا یونان تھا۔ خاک وطن کی پرستش' پیدائشی خوئے آقائی و حق آقائی' طاقتور کے مفاد کا عملی مظاہرہ' عصمت کی معراج' بچوں کے لئے اجتماعی شفقت و ناز برداری اور مقصد وہی حصول لذت۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قبل مسیح کی اقدار اور مقاصد کے راستے اب ان ''خدائی راستوں سے'' مل رہے ہیں جہاں پوری دنیا اور پوری زندگی جہنم جبکہ انسان اس جہنم کا ایندھن بن کر رہ گئے ہیں۔ قدرتی اصول

ارتقاء کی رو سے انسان کو یہ منزل چھوڑے ہوئے مدت ہو چکی جب وہ کھانے پینے اور لڑ بھڑ کر مر جانے والا کیڑا تھا۔ ڈیڑھ ہزار برس ہوئے اسے کھلم کھلا بتا دیا گیا تھا کہ کھانے پینے کے لئے زندہ نہیں رہنا بلکہ زندہ رہنے کے لئے کھانا پینا ہے اور زندگی بھی ایک مقصد کے لئے ہے۔ وہ مقصد گوہرِ ذات کی جلا ہے جس کا منتہیٰ یہ ہے کہ ''جب وہ اپنے رب کی طرف واپس لوٹے تو پر سکون و مطمئن ہو' نہ اسے اپنے رب سے کوئی شکایت ہو نہ رب کو اس سے کوئی شکایت''۔

ہم جن تپتے ہوئے صحراؤں میں نکل گئے ہیں وہ امن وطمانیت سوز اور کبھی بھی رب تک نہ پہنچانے والے سراب ہیں اور ہمیں اس سفر سے جو کچھ مل رہا ہے وہ سرتاپا شکایت اور خوف و حزن سے معمور چیخیں ہیں۔ ہمارا اختیار کردہ راستہ قدرت کے مقاصد کی مقاومت بلکہ گستاخانہ مقاومت ہے۔ زندگی کے بحرِ پرآشوب میں خس و خاشاک کا نشان بھی نہیں ملتا۔ باقی وہ رہتا ہے جو نوعِ انسانی کے لئے نفع رساں ہو۔ قدرت کے مقاصد میں اس کا رفیق و ہمراہ بننے کے لئے ۶۲۸ء میں جن پاؤں کو دھونے کی حسرت رہ گئی تھی' وہ دھونے ہی پڑیں گے۔

صلاح الدین ناسک کی ''افکارِ سیاسی' مشرق و مغرب'' سے ماخوذ

(انتخاب: حافظ محبوب احمد خان)

بقیہ: عرضِ احوال

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!!

حکومت کے عزائم کسی سے مخفی نہیں ہیں۔ عدالتوں کی صورت حال بھی ہرگز اطمینان بخش نہیں ہے۔ امریکہ کی خوشنودی کا حصول ہمارے حکمرانوں کی ترجیح اوّل ہے جبکہ امریکہ اسلام دشمنی میں تمام حدود پھلانگ چکا ہے۔ تاہم سب سے اوپر اختیار و اقتدار کا مالک وہ پروردگارِ عالم ہے' جو ہمارا مولائے حقیقی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ کوئی تکلیف' کوئی مصیبت' کوئی آزمائش اس کے اذن کے بغیر نہیں آتی۔ ہماری نماز' قربانی اور جینا اور مرنا سب اسی پروردگارِ عالم کے لئے ہے۔ ہم استقامت کے لئے بھی اسی سے توفیق کے طالب ہیں اور اسی کے سامنے عرض گزار ہیں کہ:

ربنا لا تجعلنا فتنة للقوم الظلمين ونجنا برحمتك من القوم الكفرين۔ آمین یا رب العالمین